رباعیات صادقین نقاش

۱۳۹۰

ویسے میں تو نجانے ابی رباعی گوئی کے
عجیب الخلقت قسم کا خط ایجاد و قائم کرنے کی کوشش کر رہا ہوں، خوش خطی
کرنے کا بھی شوقین ہوں اور اپنی رباعی گوئی کو خطاطی کی سپر میں چند اعتراض سے بچا لینا صورت میں
پڑھنے میں بڑا بھاری پڑتا ہے کہ بعض حروف سے الفاظ سے، کچھ معلوم اور نامعلوم وجوہات کی بنا پر آپس
یار ہوتا ہے اور بعض سے الجھن، جو حروف اچھے لگتے ہیں وہ بڑے چاؤ سے لکھے جاتے ہیں اور اسی لیے
اُن کے خم و پیچ میں ایک حسن خاص نمودار ہونے کا امکان پیدا ہوتا ہے، لہٰذا میں اپنی رباعی گوئی کے سلسلے
کو بھلے لگنے اور بات رکھنے کے لیے نوع بہ نوع طبیعت کی خاطر اگر کچھ چاؤ سے کم سے کم سطروں میں اپنی پسند کے حروف
استعمال کرتا ہوں تاکہ اُن سے جو لفظ بنیں وہ آپس میں ایک دوسرے
سے منسلک ہو کر ایک دوسرے میں سما کر پورے مصرعے کو صوری اعتبار سے
جھومتا ہوا رقص کرتا ہوا سا نظر نواز معلوم ہوں تو اس بات کے کہنے میں کچھ نہ کچھ
صداقت ضرور ہے، مجھے واقعی ایک بحر کے بعض حروف لکھنے میں مزا آتا ہے اور بعض میں نہیں
ایسے ہی اُن سے بننے والے الفاظ کے بعد و قرب کی بھی صورت ہے، بعض الفاظ اپنے اجتماعی انداز
میں ایک دوسرے لفظ سے جسمانی رشتے کے اعتبار سے آپس میں ایک رابطہ خاص پیدا کرتے ہیں تو اُن کا
آپس میں رتعلق ایک حسن پیدا کرتا ہے۔ بہت چھوٹی سی مثال دیجیے گا مثلاً ہم نے اگر زلف کے
تو اس کی خوش خطی میں کوئی خاص گھماؤ پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن میں نے اگر زلف کے تو میں کے نون
کو ایسے کھینچ کر نے کا انداز قائم (ان میں اس طرح جھٹ سے بٹھا)
جا سکتا ہے کہ دونوں لفظ ایک دوسرے میں عاشق اور معشوق

(۳۶)

اُن کے خم و پیچ میں کسی کیطرح سمٹے ہوئے معلوم ہوں، لفظ کے معنی و مفہوم کے اعتبار سے
کھنچتا ہوا چلا جائیگا اور اگر "خم" بھی کی بجائی ہے مثلاً "خم" لکھا جائیگا تو شین کا دائرہ "خم" شین میں خم
تو اس لفظ کی جسمانی ساخت ایسی ہو کر اس لفظ کے معنی و مفہوم کو ظاہر کر دیگا، اب اگر "خم" کی بجائے "خم" لکھا جائیگا
میں اپنی پسند کے الفاظ خطاطی کے نقطۂ نظر سے شامل کیے جاتے ہونگے، بعض بعض جگہ تو یہ کوشش
شعوری طور پر کی گئی ہے۔
تحریر بھی [illegible] اوقات [illegible]

ہر ہنر کے پاس ایک امانت آسمانی ہوتا ہے اس کو بروئے کار لانا امانت میں خیانت کرنے
اور بروئے کار لانا اپنے نزدیک عیسیٰ [illegible] سے کسب کمال کی توفیق بھی اور برکت
عنایت ہوتی ہے اور روز و شب کا ذوق شادی کا ہے، فنی اعتکاف ایک اضطراری کیفیت کی گرفت میں
آکر بیٹھتے ہیں اور پیشہ خانہ تو تمام سے باہر زمانے کی کھینچے جاتے ہیں جہاں گردش شام و سحر کا جانا ہوا جگر
ایک حصہ جس کا عدم ہوتا ہے، اپنے وجود کا ایک ایک لمحہ کام میں لگا دیا جاتا ہے، دنیا کی بڑی سے بڑی رنگینی
جو تصور میں لائی جا سکتی ہے کام کی طرف سے ذرا سی بھی دیر کو گردن موڑنے کے لیے ہیچ معلوم ہوتی ہے، زندگی کی
چند ہی راتیں ایسی ہوں گی جن میں شب زندہ داری کے ساتھ الصلوٰۃ خیر من النوم نہ سنا ہو۔ بہرکیف مختصر
یہ کہ کام جس کا کہ اپنی فطرت شاید اور جس کا شوق زندگی سے
پیار کی طرف مائل کیے ہوئے ہے
۴۰

کام کرنے کے لیے زندہ رہنے والوں میں سے ہوں
نجات کا یہی راستہ ہے، کام ہوتا رہتا ہے، اچھا کام اچھے کام کے ارادے سے نہیں
بلکہ خود بخود ہی ہو جاتا ہے، میں برا بھلا جیسا بھی ہوتا رہے اقتادِ طبیعت سے مجبور ہو کر کام کرتا
رہتا ہوں، کام کرتے رہنے کے اس تسلسل میں اس بات کے امکان کی طرف سے ناامید نہیں ہوتا کہ شاید
سو دو سو میں اتفاق سے برا بھلا کام کرنے کے دوران میں کسی اچھے کام کے ہو جانے کا واقعہ بھی پیش آ جائے لہٰذا کام
ہوتا رہتا ہے اور اگر ابھی تک کوئی اچھا کام نہیں کر سکا ہوں تو مستقبل میں اچھے کام کے ہو جانے کے اتفاقی
امکان کی طرف سے مایوس نہیں ہوا ہوں۔

کام اپنے لیے ان کا راستہ ہے، نظامِ الحیات ہے
اس کے ترک پر اپنا کوئی اختیار نہیں ہے، اگر سونے کا بنا ہوا ایک شہر اپنی ملکیت اس شرط
پر بالفرض قرار دیا جائے کہ آئندہ پنسل قلم کاغذ وغیرہ کو ہاتھ نہ لگانے کی صورت میں یہ معمورۂ طلائی تمہارا ہے
میں بھی ہوئی دو خیر کہاں نازپرور کے تمہارا رہے تو میں اس پیش کش کو رد کرتے ہوئے کہ اس شرط کو پورا کرنا میرے
اختیار سے باہر ہے انکار کر دوں گا۔ اس کے برعکس اگر یہ کہا جائے کہ قلم یا موقلم یا رنگ کا چھونا جرم ہے اور اس کو چھونے
کی سزا پانچ دُرّے ہیں تو پانچ لاکھ کوڑے دیکھتے ہوئے بھی زیادہ تر تصور کا نقش گروں تصور کا کرنے میں جاں تو ضرور ہوں گا
مگر پھر بھی اضطراری طور پر بے اختیار انداز سے بغیر سوچے سمجھے جرم کا کشی مرتکب ہو ہی جاؤں گا۔
میں کئی روز تک مسلسل بغیر کھائے زندہ رہ سکتا ہوں، کئی راتوں بغیر سوئے
مگر بغیر کچھ نہ کچھ کام کیے ایک دن بھی نہیں۔ ان ہی محسوسات کے اظہار کیلئے یہ رباعی کہی تھی:

گر ترکِ محبت کی جزا ہیں توڑے
گر جرمِ محبت کی سزا ہیں کوڑے
کوڑے سے ہمیں منظور رہیں ورنہ دل میں
سرطانِ جمود کے مریض کے پھوڑے

حالت یہ ہے کہ جس ٹوٹی ہوئی چوکی پر کام کرتا ہوں اس کے علاوہ مجبوراً کہیں اور بیٹھا ہوں تو
ایک تشنج آمیز بے چینی محسوس کرتا ہوں، یوگا کی نشستوں اور زاویوں سے زیادہ پیچیدہ اور مختلف
پہلوؤں سے کام کیا جاتا ہے، اس چوکی کے بارے میں کسی نے کہہ بھی رہا تھا کہ یا تو بطنِ مادری میں سکون
ملا ہو گا یا پھر قبر کی تاریکی ہی میں ملے گا ورنہ دنیا میں صرف اس چوکی پر ہی آرام معلوم ہوتا ہے، ہر چند کہ مجھے
اس وقت کی تمام اپنی گفتگو بکر دم کر خود صورت حال پر کاری قسم کا مصداق نظر آتی ہے لیکن قدرتِ تلافی
حقیقتِ احوال کا اعلان خفیف کر دیا گیا ہے جس پر کچھ
ندامت سی بھی ہے

تصویروں کی طرح اپنی رباعیوں کے
بھی تمام کے تمام خاندان ایسے ہیں کہ جس خاندان کی جو رباعی ہے اس خاندان
کی دیگر رباعیوں سے شکل و شباہت، معنی و مفہوم میں ملتی جلتی ہے، بات ایک ہی ہے کہنے کا طریقہ
اور زاویہ مختلف ہے، اس پر بھی تصویروں کی طرح تکرار کا اعتراض ہو سکتا ہے، یا ایک ہی روش کیوں ہوئی؟
سال ہیں، اس کے علاوہ اپنی اقتادِ طبع اور نظریۂ جمال یہ ہے کہ کسی شے کا جمالیاتی مشاہدہ ہر زاویے اور ہر پہلو سے

[illegible]

جزوی ہوتی ہے، دھوپ میں اُسی چیز کو
دیکھو تو اور ہی رنگ ہوتا ہے، سایہ، شطرنج کی شکل میں، بارشوں کے، چاند کی چاندنی میں
دیکھو تو کچھ اور ہی روپ نظر آتا ہے، مختلف اوقات میں، مختلف زاویوں سے شے کے مختلف رنگ اور مختلف
پہلو نظر آتے ہیں۔ فنِ مصوری میں ہر اپنے موضوع تصویر کو ایک خاص ذاتی زاویے سے دیکھتا ہے، کوئی سہ جہتی پہلو
ہے، شش جہت سے دیکھا جا سکتا ہے، اب ہر جہت کے درمیان میں بے شمار زاویے ہیں جہاں سے اس
پر نظر ڈالی جا سکتی ہے اور اگر ان زاویوں کو آپس میں ضرب دیے بغیر شروع کر دیا جائے تو زاویوں کا یہ سلسلہ اور شے
کے پہلوؤں کا سلسلہ لامتناہی ہو کر پھیلتا چلا جائے گا۔ تو شے کے وجود کے لامتناہی گوناگوں زاویوں اور صفتوں کا
بکھرا مجموعہ تصویر ایک ایسی سطح پر جس میں صرف طول اور عرض کی
دو جہتیں ہوں، پیش کرنے کی سعیٔ پیہم کا سلسلہ جاری رہتا ہے۔

اور یہ سعیٔ پیہم کا سلسلہ موضوعِ محض شے کے وجود کو اپنے وجود میں اور اپنے وجود
کو موضوعِ محض شے کے وجود میں زردی اور سبزی کی طرح لاشعوری طور پر ذہنی ارتقا کے بعد جذب
دینے کے لیے جو ارادی طور پر جاری ہوتا ہے اور پھر بالخصوص سعیٔ پیہم ہوتی بھی جاتی ہے، موضوع سے خصوص
موضوع کا ہر رنگ روپ کھینچ لینے کی بجائے کر دیتا ہے۔ سعیٔ مسلسل اور پھر سعی کے اس عمل کو دہرایا ہوا ہوتا ہے
ای حقیقت بڑی ثابت کرنے کی ہے، موضوع کی محبت اور بڑی موضوعیت سے وابستگی کے اس سلسلے کو "تکرار" کہتا ہے
فرحت ابھی تک بھی نہیں آئی کیونکہ شیوۂ اہلِ نظر کی آبرو ہر حال برقرار رکھنی ہوتی ہے
خلاصۂ اعتراضات سے بچ کر اس کے فن میں تکرار ہے
تصویر ہے، رنگ ہیں جن میں تو بیری و بد صورتی ہے
کی طرف سے صادر ہوا ہے کہ جمود نے ہے ہی نظر سے

لطف ہے کہ یہ اعتراض اُن حضرات
ہوئی نظر سے دیکھا ہے، تکرار کے بارے میں میں نے ایک معمولی سی مثال یہ دی کہ ہندسہ ۵ ہے۔
دو اور تین کو جمع کریں، چار اور ایک کو جمع کریں تو نتیجہ ۵ ہی ہوگا۔ ۵ کو ایک سے ضرب دیدیں
یا پچیس کو ۵ سے تقسیم کر دیں یا سات میں سے دو کو نکال دیں تو ۵ ہی باقی بچے گا اور یہ ۵ کے
وجود کے مختلف پہلو ہیں اور یہ پہلو اتنے ہیں کہ تعداد و شمار کی حدوں کو توڑ کر لامتناہیت کا عالم بیکراں ہیں
۵ کو ریاضیاتی طور پر مختلف زاویوں سے دیکھنا تکرار نہیں ہے بلکہ ۵ کے وجود کے ادراک کرنے کا
طریقہ کار ہے۔

کا جواب دینے کے لیے کیونکہ اب بیاض میں گنجائش نہیں رہی (اس کے یہاں رنگ نہیں ہے، اس اعتراض
صرف یہ کہوں گا کہ اگر دل سے نکلی ہوتی) تو سادہ الفاظ میں کہی جاتی کہ کیا رضا ہے، اس قسم
کی بات کسی اور سلسلے میں دریافت کے اوراق میں کر چکا ہوں لہذا اس سے اعتراض کا مختصر جائزہ لیا جائے
یعنی اس کے یہاں بد صورتی نیز رنگ اور رنگ ہے، اس کا مختصر سا جواب فی الحال یہ ہے کہ میں جب کبھی کسی

(۲) کرم جناب ڈاکٹر وزیر آغا صاحب کی کتاب ... تصویر ... کا سلسلہ ...
تصویر بنانا ہوں تو کیا جانا ہے کہ اس کا فن ... اور صورت
اعتراض کی بنیاد ان کا تصویر فن کی ... ایسا ہے کہ ... شکل ... ہے
ایسا نہیں ہے ... اصول ... طریقہ ... کی ...

اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ یہ لوگ
یہ چاہتے ہیں کہ انسانیت پر مظالم ڈھانے والے جلادوں، شقی القلب کی داستانوں
کی زرق برق لباس میں شوخ و شنگ تصویریں بناؤں، جہاں میرا ایمان بھی ضرور ہے کہ مجھ
بہت سی زیادہ ہے کہ کسی نفع خور کی آراستہ نشست میں اس کی داشتہ کی معشوقانہ اور بناوٹی کھوکھلی مسکراہٹ
میرے لیے یہ مشکل ہے، ڈسٹ بن پر پھینکے ہوئے پس خوردہ کی جب ایک ننگا بھوکا آدمی تلاش کرتا ہے اور جب
اس جدوجہد میں کامیاب ہوتا ہے تو اس کے چہرے کا جو تاثر نیم خر معلوم ہوتا ہے، منارہ مریم کا نہیں
میں تو گٹر کا مصور ہوں، شاہ نشینوں کی آرائشی ماحول اور خوشبوؤں سے نہیں
ڈسٹ بن کے تعفن میں سچائی کی تلاش کرتا ہوں

یہی نوعیت کی بھی نگارشات اور مصوری کی نفاست، آرائش
کے ہر ذرے کے پیچھے نہیں بلکہ ہر ذرے کے آگے ایک قسم کی خود نمائی اور خود پرستی بھی یا تحتی
بڑی نظر سے تو کوئی تعمیر کی بات نہیں ہو گی، یہ فنی کھیل رنگینی اور بھدگی سے نہیں، صفائی اور سادگی سے
کھیل کی یہ ہوتی ہے کہ جو خود اپنے ہی آئینے سے خود پوچھتا ہوں کہ ایسی نفاست کے ہاتھوں، خطاطی کے ذریعے
دوں میں شعوری آرزو بھی تو نے اپنی انا شکستہ تاثرات کی تلاش تو نہیں کرا لکھی ہے اور اب تحریروں میں شعور
یہ الفاظ بھی مجھے ایک ماری ہوئی تو بے رنگ معلوم ہوتا ہے لہٰذا میں اس سے بھی درگزر کرتا ہوں

اگر باریک ہنر کی یہ تصویر جلد دیکھنے والے
کو اچھی لگ رہی ہو تو میں اس کی داد نہیں چاہتا ہوں لیکن اگر بُری ہے
تو اس کو برا کہنے سے پہلے بہت گزارش کرتا ہوں، اس کی اشاعت اول ربیع الاول ۱۳۹۰ھ
باشاید ربیع الثانی ۱۳۹۰ھ میں ہوئی تھی، میں نے برائے خیال کا آدمی ہوں گی وجہ سے اس کا نام جدید روش پر
نہیں رکھا تھا، بلکہ زندگی کی صدرِ قیمت رکھا تھا لیکن ری قراءت پر بھی اس سے بھی مطمئن نہیں تھی
کیونکہ آئیے وقت کے لوگ ایسی کتابوں کا نام تاریخی بھی رکھا کرتے تھے تو اس میں زندہ قباحت کا عنصر شامل
کرنے کی نیت نام بدلنا چاہا اور آنے کو نقش دینے سے جو نوراتی مادہ تاریخ کسی بھی کوشش کے
یہ نوع کا بدلنا اور ری آنکھیں مچل گئیں، بہرکیف اشاعت دوم کے وقت
یہ باتیں بنانی ضروری تھیں اور کیونکہ ناشر والی طباعت اول کی طرح ان
رباعیوں کی اشاعت دوم کی جلد کو از قسم سیٹ نقشہ سے آلودہ نہیں کرنا
چاہتا تھا، لہٰذا اس سے متعلق کچھ ضروری اور غیر ضروری پیرٹ بنالے اس بیاض میں لکھ دی ہیں اور
اب اس بیاض کے بارے میں کچھ عرض داشت ہے

تھوڑی دیر پہلے میں بیاض کی رباعیوں والے حصے پر صفحوں کے نمبر لکھ رہا تھا تو جاپانی رباعیوں کے
سطروں میں سے میں اور ہر جانب کی چلمنوں میں سے اُن چند
حسینانِ آشنا کے دمکتے ہوئے مکھڑے جھانکتے ہوئے نظر آ رہے تھے جن کے
چھوڑے ہوئے جاپانی تاثر میں یہ رباعیاں کہی گئی تھیں، میں اُن چند
گیسوؤں والوں کا ابرو کے کمانداروں کا دل کی گہرائیوں سے شکر گزار ہوں جن کی کرم فرمائیاں
ان رباعیوں کی تحریک میں تبدیل ہو گئیں۔

آپ کا کاتب، بندہ مرزا اسد اللہ خان غالب) رضظ بیگ بےچین
شہر یار و نگار رقیب، مسکین و عزیز
صادقین (نقاش)

سلطین منزل، ناظم آباد، کراچی بروز منگل ۲۱ رجب المرجب ۱۳۹۱ھ (۲۱ ستمبر ۱۹۷۱ء)

٭ مراد اُن رباعیوں سے ہے جو بیاضِ صادقین میں شامل تھیں

اک بار میں ساحری بھی کر کے دیکھوں
کیا فرق ہے شاعری بھی کر کے دیکھوں
تصویروں میں اشعار کہے ہیں میں نے
شعروں میں مصوری بھی کر کے دیکھوں

عاصی صادقین عفی عنہ

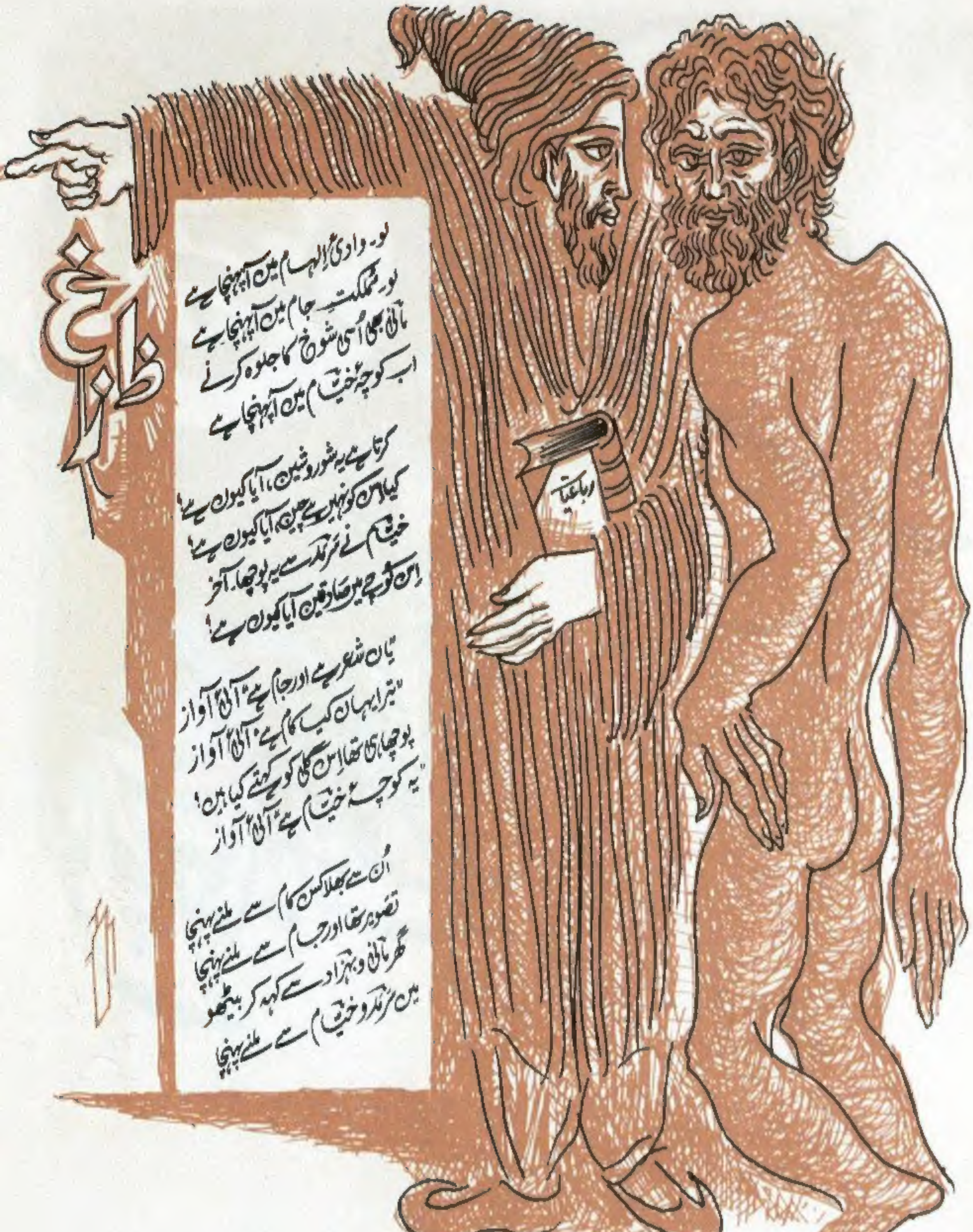

لو، وادیٔ الہام میں آپہنچا ہے
لو، مملکتِ جام میں آپہنچا ہے
مانی بھی اُسی شوخ کا جلوہ کرنے
اب کوچۂ خیّام میں آپہنچا ہے

کرتا ہے یہ شور و شین، "آیا کیوں ہے"
کیا اس کو نہیں ہے چین، آیا کیوں ہے"
خیّام نے ترمذ سے یہ پوچھا، آخر
"اس کوچے میں صادقین آیا کیوں ہے"

یاں شعر ہے اور جام ہے" آئی آواز
"تیرا یہاں کیا کام ہے" آئی آواز
پوچھا ہی تھا اس گلی کو کہتے کیا ہیں؟
"یہ کوچۂ خیّام ہے" آئی آواز

اُن سے بھلا کس کام سے ملنے پہنچی
تصویر تھا اور جام سے ملنے پہنچا
گھر مانی و بہزاد سے کہہ کر بیٹھو
میں ترمذ و خیّام سے ملنے پہنچا

رباعیات

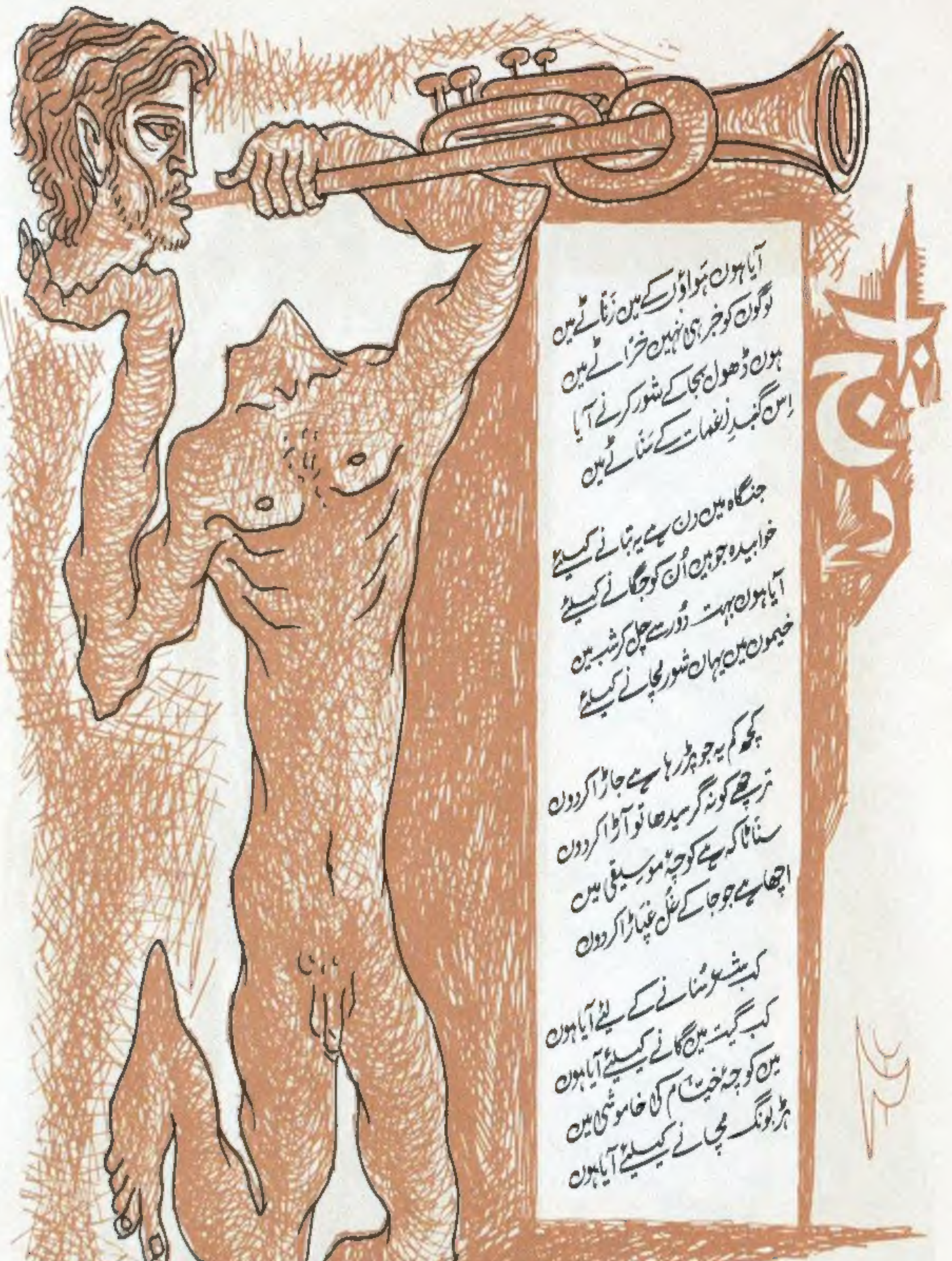

آیا ہوں ہواؤں کے میں زناٹے میں
لوگوں کو خبر ہی نہیں خراٹے میں
ہوں ڈھول بجا کے شور کرنے آیا
اِس گنبدِ نغمات کے سناٹے میں

جنگاہ میں رن ہے یہ بتانے کیلئے
خوابیدہ جو ہیں اُن کو جگانے کیلئے
آیا ہوں بہت دُور سے چل کر شب میں
خیموں میں یہاں شور مچانے کیلئے

کچھ کم یہ جو پڑ رہا ہے جاڑا کر دوں
ترچھے کو نہ گر سیدھا تو آڑا کر دوں
سناٹا کہ ہے کوچۂ موسیقی میں
اچھا ہے جو جا کے غل غپاڑا کر دوں

کب شعر سنانے کے لئے آیا ہوں
کب گیت میں گانے کیلئے آیا ہوں
میں کوچۂ خیام کی خاموشی میں
ہڑبونگ مچانے کیلئے آیا ہوں

معشوق پئے جام بکف جاتا ہوں
غم غم کے بجاتا ہوا دف جاتا ہوں
عرفی مری بستی میں چھتا آیا، اب میں
معمورۂ عرفی کی طرف جاتا ہوں
الوان! میں ترکِ حرم و دیر کروں؟
اس دل کی بھی حالت کو ذرا غیر کروں
میں قوسِ قزح کے پل پہ پیدل چل کر
معمورۂ ابجد کی ذرا سیر کروں
اے عالمِ ابجد! بڑا بانکا میں ہوں
کیا تجھ کو بتاؤں کہ کہاں کا میں ہوں
میں تو ہوں تری سیر کو آیا۔ ویسے
اک اور ہی دنیا ہے جہاں کا میں ہوں
وہ درد جو دل میں ہوں سہنے والا
الوان و خطوط میں ہوں کہنے والا
آیا ہوں تری سیر کو شہرِ ابجد!
میں شہرِ مداد کا ہوں رہنے والا

میں کوچۂ رباعی کے جو اندر آیا
جس طرح کہ بَن میں رام چندر آیا
تو بولے مدینۂ سخن کے شہری
یہ کون یہاں مست قلندر آیا

اُس رُخ میں نے حسنِ کرم کو دیکھا
اُس زلف میں اک اور ہی خم کو دیکھا
کچھ دیر کو تو قلم کو رکھ کے میں نے
اک بار اُٹھا کر جو قلم کو دیکھا

پہلے میں رہا کرتا تھا بیت خانوں میں
پھیلے ہوئے الوان کے میدانوں میں
اب اُن سے نکل کر میں نجانے آکر
کیوں قید ہوں الفاظ کے تہ خانوں میں

کچھ دن سے شب و روز لگا ہے یہ جنوں
کس نے یہ کہا تھا، میں یہی سوچتا ہوں
شہراہ و مدار ہر رواں تھا، لیکن
الفاظ کی اب بھول بھلیوں میں ہوں کیوں

ہو شغلِ مے و جام میں، آوارہ ہو
لگ جاؤ کسی کام میں، آوارہ ہو
اے سیّد صادقین احمد نقوی!
کیوں کوچۂ خیّام میں آوارہ ہو
اِس رنگ میں جو کچھ مری تقصیریں ہیں
واقف ہوں، یہ جو کچھ مری تحریریں ہیں
پردہ ہیں۔ پسِ پردہ بتاؤں کیا ہے!
عریانی کی بنائی ہوئی تصویریں ہیں
ہیں گیسو و ابرو کے بھی خم اے یار!
خلیے میں ہے سو قسم کا عالم اے یار!
عریانی کم و بیش تھا مصور جتنا
اتنا ہی میں شاعر ہوں کم از کم اے یار!
خود تڑپوں گا اوروں کو بھی تڑپاؤں گا
میں شہر میں ساقی کے اماں پاؤں گا
خیّام کی بستی سے، سحر ہوتے ہی
کچھ روشنی پھیلے تو چلا جاؤں گا

دو دن کو ہوں بس شہر میں اشعار کے ہیں
جب مجھ سے چلا جاؤں گا سب ہار کے ہیں
کرتا ہوں نگارِ شعر! تیری خاطر
معشوقۂ تصویر کا حق مار کے ہیں

نقاد کی ڈانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں
تقطیع کے بانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں
اِک اصول کے مضمون کی خاطر یعنی
الفاظ کے کانٹوں میں ہوں اُلجھا ہوا میں

فیتے سے عروض باز کیونکر ناپیں
اشعار کا سوز و ساز کیونکر ناپیں
محبوب کے اعضا کی کریں پیمائش
لیکن وہ ادائے ناز کیونکر ناپیں

بے بہرہ کیے عقل سے قاضی مجھ کو
وجدان نے کیا شعر پہ راضی مجھ کو
میں علمِ عروض میں ہوں بالکل کورا
یہ علمِ عروض ہے ریاضی مجھ کو

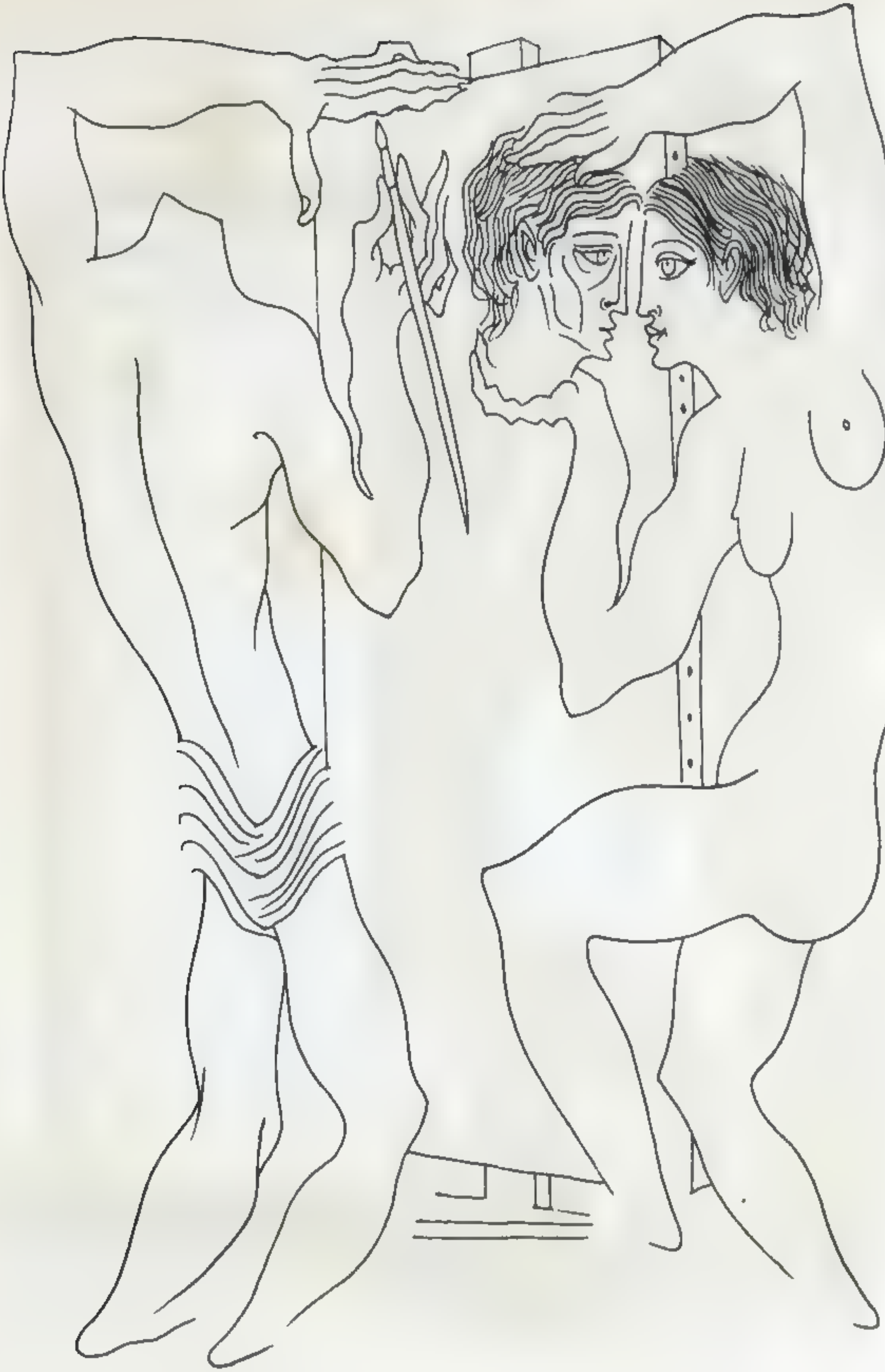

تعلقاتِ نقش و نقاش

یہ تیرا پری! پیار ہے؟ جسمیں قیدی ہوں
اک رب کی دیوار ہے جسمیں قیدی ہوں
بے چینی کی اک کھوہ ہے جس میں دل ہے
تنہائی کا اک غار ہے جسمیں قیدی ہوں

ہے حور کا یا روحِ حسن کا قبضہ
کتنا ہے مکمل یہ ہمہ حسن کا قبضہ
ویسے ہی تڑپتا ہوں وہ جیسے چاہے
پر میرے وجود پر ہے کس کا قبضہ!

یوں کرتی ہوئی جلوہ گری ہے یہ کون؟
پہنے ہوئے پوشاک پری ہے یہ کون؟
تخلیق کے فن کا جو اثر ہے مجھ پر
ہاں میرے تصور میں پری ہے یہ کون!

مجھ پر نہیں دیو زرگری کا قبضہ
آسیب ہو کسی خودسری کا قبضہ
قابو میں تو جنات ہیں میرے لیکن
مجھ پر ہے کسی سبز پری کا قبضہ

اس محفلِ نور میں ہوں بالکل مجبور
حوروں کے تصور میں ہوں بالکل مجبور
جنات کے آگے ہوں مکمل مختار
پریوں کے حضور میں ہوں بالکل مجبور

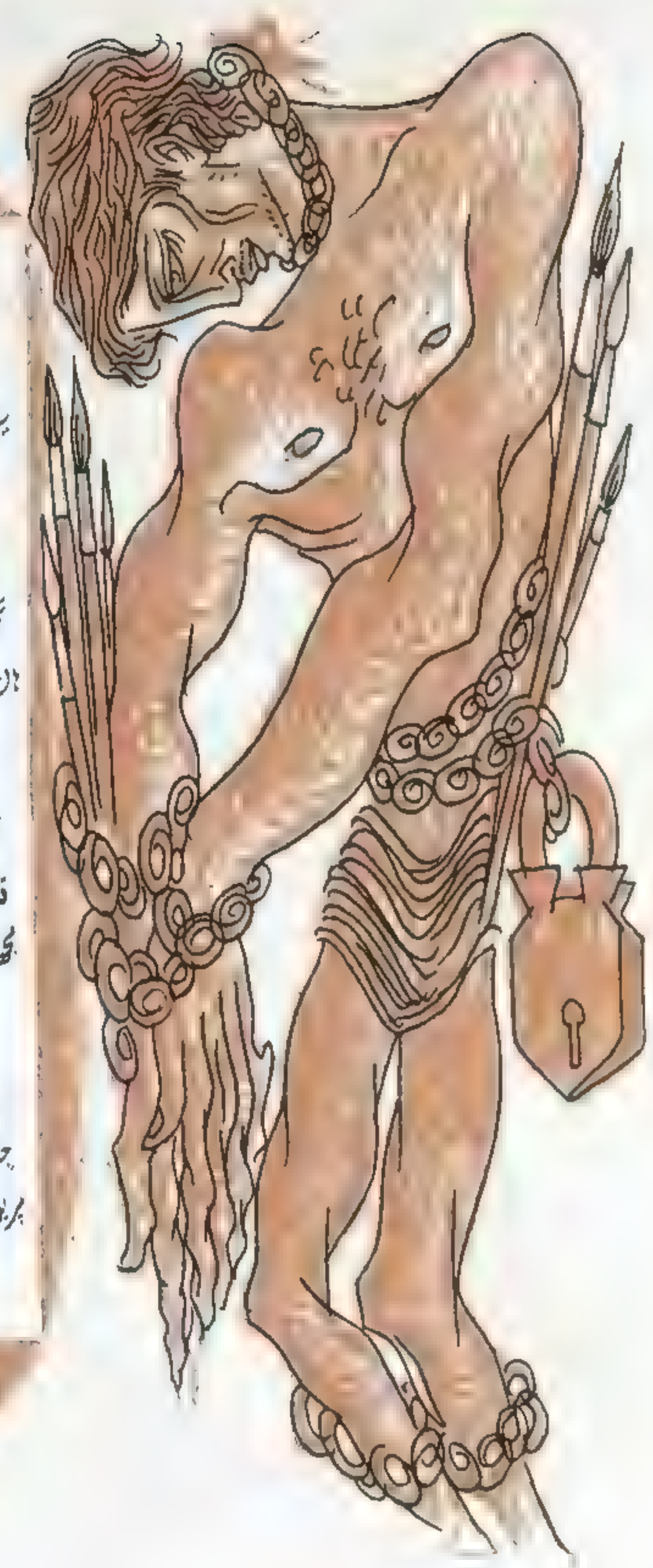

اے شوخ! میں زندگی میں تجھ تک پہنچی
اک عالمِ سرخوشی میں تجھ تک پہنچی
ہستی کی سیہ رات میں چلتے چلتے
ٹکڑوں کی میں روشنی میں تجھ تک پہنچی

اے شوخ! خدوخال بناتا کیونکر؟
ظاہر ہے سکان تیرا پاتا کیونکر!
ہوتی جو نہ گیسوؤں کی چھاؤں سر پر
اس دھوپ میں چل کر یہاں آتا کیونکر!

روشن ہے اجواب ہے حال میرا تجھ پر
ہاں ختم ہے اک سوال میرا تجھ پر
ہے کتنے ہی گیسوؤں میں ہوکر پہنچی
شانہ بن کر خیال میرا تجھ پر

دل میں ستم ایجاد جو آئی کل رات
لب پر سے فریاد جو آئی کل رات
میں اپنے فراق میں بہت ہی تڑپا
خود تجھ کو مری یاد جو آئی کل رات

باغی تھا، بغاوت میں بھٹک کر اُبھرا ہوں
زنداں میں تھا لایا گیا پکڑا ہوا ہوں
پھر توڑ کے آہنی سلاسل کب سے
ہوں زُلف کے اِک بال میں جکڑا ہوا ہوں

ہاں اُس کی نہ ہے تنگ نہ ڈھیلی پوشاک
عُنابی نہ ہے سُرخ نہ پیلی پوشاک
اِک شوخ پری حسن کا ہے مجھ پر جلد
پہنے ہوئے رہتی ہے وہ نیلی پوشاک

آکاش کے تاروں پہ ہوں ناچا میں خود
تھیں فرش، بہاروں پہ ہو رقصاں میں خود
جنات کو اُنگلی پہ نچا کر اپنی
پریوں کے اِشاروں پہ ہوں ناچا میں خود

اینٹوں کا کھرنجہ ہے کہ جس میں میں ہوں
فولاد کا پنجہ ہے کہ جس میں میں ہوں
اِس کو کوئی کستا ہی چلا جاتا ہے
یہ کیسا شکنجہ ہے کہ جس میں میں ہوں!

کرتا ہوں کبھی غور اِدھر پردے میں
کس کے ہیں یہ سب طور اُدھر پردے میں
مجھ سے جو کچھ کہ ہو رہا ہے سرزد
کرتا ہے کوئی اور اِدھر پردے میں
قرطاس پہ ہاں جلوے دکھاتا ہے یہ کون!
پردے میں مرے نقش بناتا ہے یہ کون!
یہ سچ ہے کہ مُو قلم گھماتا میں ہوں
پوروں پہ مرا ہاتھ گھماتا ہے یہ کون!
کیسی ہیں جنونِ شوق تری رسمیں
پیمانِ محبت کے، وفا کی قسمیں
خود پر مجھے قابو ہی نہیں ہے بالکل
معلوم نہیں کچھ کہ ہوں کس کے بس میں!
یہ کونسا وقت ہے کہ جس میں، میں ہوں!
اک منزلِ بخت ہے کہ جس میں، میں ہوں!
یہ کیا شکنجہ ہے کہ جس میں دل ہے!
یہ کس کی گرفت ہے کہ جس میں، میں ہوں!

اک صورتِ بے نام کو دیکھا میں نے
پھر صبح نہ پھر شام کو دیکھا میں نے
جب گردشِ ایام سے باہر جا کر
اس گردشِ ایام کو دیکھا میں نے

کیا رات ہے! ہاں اے دلِ ناداں! کہیے
اب مجھ سے "چلیں سوئے بیاباں" کہیے
اس شہرِ شب و روز کے نقشے میں نہیں
وہ کوچہ جسے کوچۂ جاناں کہیے

ان اپنے شب و روز میں جیسے میں ہوں
سچائی کی جستجو میں کیسے میں ہوں!
ویرانۂ نجد میں تھا جیسے مجنوں
لمحات کے صحرا میں کچھ ایسے میں ہوں

اے دوست! اندھیرے میں کہ تو سوتا ہے
اور کھیت اجالا ہو تو پھر بوتا ہے
ہے تیرا برس تین سو پینسٹھ دن کا
اور میرا کئی سال کا دن ہوتا ہے

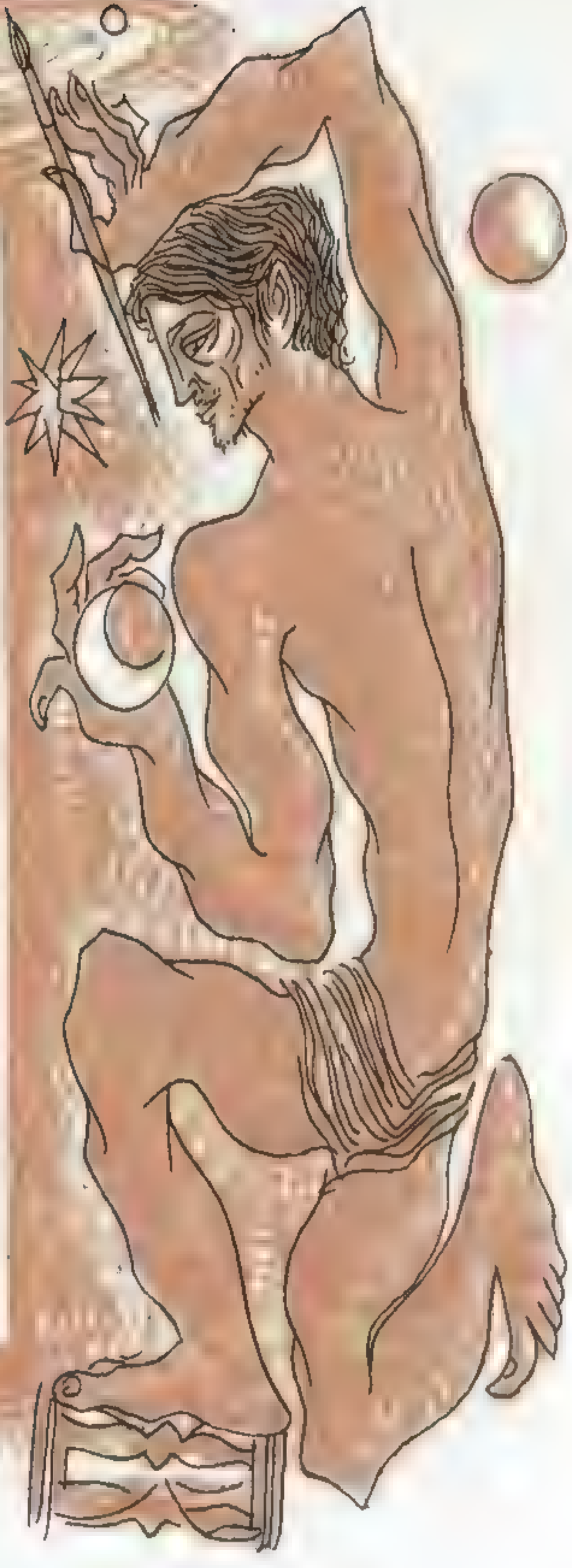

پھانکی ہے محبت کی جو شکر میں نے
آرام پہ ماری ہے ٹھوکر میں نے
پھر خانۂ تقویم سے باہر جا کر
دیکھا ہے شب و روز کا چکر میں نے

شب بھر نہیں سوتا ہوں کوئی کیا جانے
اور موتی پروتا ہوں کوئی کیا جانے
سو جاتی ہے جب ساری یہ دنیا پھر بھی
جاگا ہوا ہوتا ہوں کوئی کیا جانے

آرام سے بھاگ کر گزارا میں نے
دنیا کو تیاگ کر گزارا میں نے
ہر دن کو مصیبت سے کاٹا اور پھر
ہر رات کو جاگ کر گزارا میں نے

بیداری سے اپنا کہ ہے رشتہ راتو!
کیسا ہے محبت کا نوشتہ راتو!
بولو کہ میں سویا ہوں کبھی بھی تم میں
اے میری جوانی کی گزشتہ راتو!

جاری ہو اگر شدتِ تخلیق کا دور
مت پوچھ، مری جان! تو اُس وقت کے طور
جو بندۂ اللہ پر گزری وہ سب
اللہ ہی جانتا ہے ورنہ کون اور!

آغاز کہ انجام، جہاں سے پوچھو
یہ قصہ کہیں سے، درمیاں سے پوچھو
تخلیق کے کرب کی جو شدت ہم پر
گزری ہے وہ اللہ میاں سے پوچھو

لکھنے ہیں شب و روز فسانے کیا کیا!
دن رات نقوش ہیں بنانے کیا کیا!
عاشق ہوں تو جانِ ناتواں کو میری
کم وقت میں کرنا ہے نہ جانے کیا کیا!

تخلیق کا دیکھا نہ ظہور اب تک
اِک نقش بھی ہو سکا نہ پورا اب تک
ہاں وقت گزرتا ہی چلا جاتا ہے
اور میرا ہے ہر کام ادھورا اب تک

اک نقشِ جلی کھینچ رہا ہے نقاش
کب خونِ جگر بیچ رہا ہے نقاش
زرخیز ہو، یہ سوچ کے، خونِ دل سے
صحرا کی زمیں سینچ رہا ہے نقاش

موقع نہ تھا، اور نقش بنایا میں نے
پھر اُس میں لہو اپنا لگایا میں نے
یہ سوچ کے، سیراب ہو، دل کا سب خون
کل ریت کے ٹیلوں پہ بہایا میں نے

آرام سے ہاں بھاگ کے کاٹی اک شب
اور سامنے بس آگ کے کاٹی اک شب
میں نے تری خدمت میں، نگارِ بے نام!
ہر رات کہ ہے جاگ کے کاٹی اک شب

وہ زلف جو تھی اور سنواری میں نے
وہ شکل جو تھی اور نکھاری میں نے
اس عمرِ عزیز کی تو اک شب
ہر رات
جاناں ہی کی خدمت میں گزاری میں نے

نقاشی نہ جانے ہے مرا دین کب سے!
فرہاد ہوں میں اور یہ ہے شیریں کب سے؟
ہے مشغلہ اچھا، پہ نہیں ہے یہ یاد
ہیں خونِ جگر میں ہاتھ رنگین کب سے

شعلہ ہے، شرارہ ہے، چھلاوا کیا ہے؟
جو پھوٹتا دل میں ہے وہ لاوا کیا ہے؟
اس کو ہی بہاتا ہوں، متاعِ عاشق
ہے خونِ جگر اس کے علاوہ کیا ہے

منقوش کیا زلف کے خم کو میں نے
کچھ پیش کیا صورتِ کم کو میں نے
اور جب بھی ڈبویا تو ڈبویا ہر بار
دل ہی کے لہو میں موقلم کو میں نے

کیوں اس کو خریدتے ہو زر سے اپنے
حاصل کرو ہاں ذوقِ نظر سے اپنے
کب پاؤں کے تیل سے بنائی میں نے
تصویر ہی خونِ جگر سے اپنے

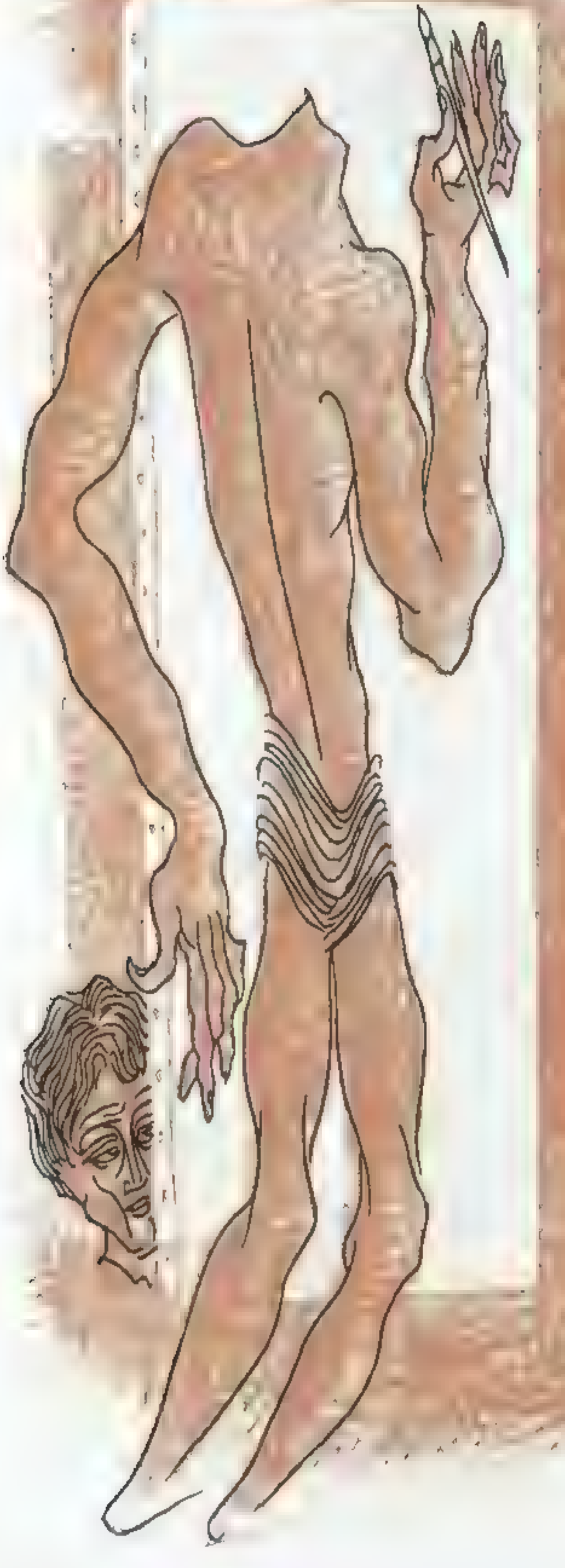

آوارہ بہت کیا ہے میں نے خود کو
دیوانہ بنا لیا ہے میں نے خود کو
تخلیق کی چکی میں، تمہارے آگے
ہاں پیس کے رکھ دیا ہے میں نے خود کو

اک رازِ دل کھول رہا ہوں کب سے
نظروں میں اُسے تول رہا ہوں کب سے
تخلیق ہے اک زہر کہ جس میں خود کو
کچھ یاد نہیں گھول رہا ہوں کب سے

تھی تیغِ جمال کی قیامت کی جو کاٹ
دکھلائے ہیں پھر عشق نے کتنے مجھے گھاٹ
یہ کربِ وجود و اضطرابِ تخلیق
دانہ ہوں تو گردش میں یہ چکی کے ہیں پاٹ

جب دل میں ہر اک درد کو پالا میں نے
شہکار کو سینے سے نکالا میں نے
اک کربِ وجود ہے کہ جس کو پیہم
ان نقش و نگار میں ہے ڈھالا میں نے

پیچیدہ ہے دستور نہ پوچھو لوگو
برسات میں مستور ہے نہ پوچھو لوگو
کیا مقصدِ زندگی ہے، جیتے کیوں ہو
ہم حسن پرستوں سے نہ پوچھو لوگو
شعر کسے کہتے ہیں؟ چھلاوا کیا ہے؟
ہم یوں ہی چلے جائیں، بلاوا کیا ہے
ہاں مسلکِ زندگی ہمارا اے دوست!
اک حسن پرستی کے علاوہ کیا ہے!
کرتے ہوئے کچھ غور نہیں لکھ سکتے
کھاتوں میں ہر طور نہیں لکھ سکتے
مکتوبِ محبت کے علاوہ یعنی
عاشق جو ہیں کچھ اور نہیں لکھ سکتے
وہ سمت کہ جس میں وہ حسیں ہے معلوم
وہ قصر کہ جس میں وہ مکیں ہے معلوم
بس کوچۂ جاناں کے علاوہ ہم کو
کچھ شہر کے نقشے میں نہیں ہے معلوم

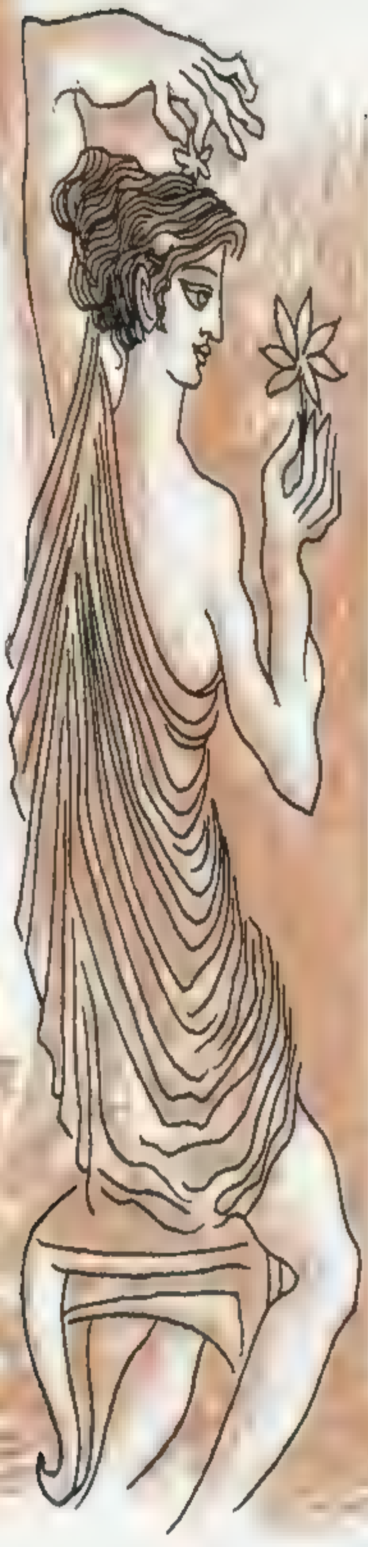

پھر مجھ میں نہ تھی ضبط کی طاقت تڑپا
جب موڑ پہ پہنچا تو بہ شدت تڑپا
میں کوچۂ جاناں سے نکل کر دو گام
اک ماہیٔ بے آب کی صورت تڑپا

ہم کچھ بھی تو خاطر میں نہیں لائیں گے
دیوار کے سائے میں اماں پائیں گے
ہم کوچۂ جاناں سے نکلتے ہی اگر
رل جائے خدائی تو نہیں جائیں گے

یہ مسئلہ کب ہے کہ کدھر جائیں گے
زندہ نہیں جائیں گے اگر جائیں گے
ہم کوچۂ جاناں سے، یقیں تو مانو
جیسے ہی کہ نکلیں گے تو مر جائیں گے

بھولے سے کبھی اور کہیں ہوتے ہیں!
ہم سایۂ دیوار نہیں ہوتے ہیں
ہم کوچۂ جاناں کے علاوہ بھی کہیں
ہوتے ہیں؟ کبھی بھی تو نہیں ہوتے ہیں

کہتا تھا مصوّر کہ محبت سی وہی تھی
جو دل میں بسی تھی، میں نے اُسے صورت دی تھی
اِک سوچ کی سادگی نے بڑھ کر، میرے
کل حسنِ تصوّر کو جو دولت دی تھی

نقاش یہ بولا کہ میں بہکا رہا تھا
پھر رک گیا، چلنے کا کہاں یارا تھا
اک سوچ کی سادگی نے آگے بڑھ کر
جب میرے خیالات کو للکارا تھا

نقاش نے کھینچی ہے سنبھل کر تصویر
اک پل پہ خیالات کے چل کر تصویر
قرطاس پہ، مستانہ خرامی کر کے
آئی ہے درِ دل سے نکل کر تصویر

تنہا ہے مری ذات، نظر آتی ہیں
کرتی ہوئی کچھ بات، نظر آتی ہیں
ہاں پردۂ خلوت پہ نہ جانے کس کی
پرچھائیاں ہر رات، نظر آتی ہیں

اپنا ہی وہ فاش راز کر کے آئی
اِک صورتِ سوز و ساز کر کے آئی
قرطاس پہ، نقاش کے دل سے یعنی
تصویر خرامِ ناز کر کے آئی

اشکالِ تصوّر میں وہ کرتی ہیں طواف
کچھ نقش نظر آئے ہیں بالکل ہی تو صاف
سائے ہیں خیالات کے مبہم جنباں
نقّاش کے سامنے ہے لوحِ شفاف

کہتا ہے مصوّر کہ ہیں گھاتیں کیا کیا!
نقّاشی میں کاٹی ہیں راتیں کیا کیا!
ہر رات، خیالات سے بسر کی ہیں
قرطاس کی سادگی نے باتیں کیا کیا!

اشکال کو خود تول رہا ہے قرطاس
تصویر کا در کھول رہا ہے قرطاس
ہاں اپنی سپیدی کی زباں سے یعنی
نقّاش سے کچھ بول رہا ہے قرطاس

ہم لوگ ہیں انکشاف کرنے والے
نظارہ بہت ہی صاف کرنے والے
پردہ دیکھ کے برقعے میں نکلا ہوا ہاتھ
اندازۂ حسنِ ناف کرنے والے

پوشاک کی لہروں میں تھا نقش خفی
کپڑے کی تجلی میں نے دیکھی عقلِ صفی
کیا حسن تھا جب اُس کی سلوٹ سے کل
ملبوس کی کروٹ سی خیالوں میں لگی

محفل میں ادا شناز کرلی میں نے
وہ چشم سی نیم باز کرلی میں نے
فتنے سے نگہ کے جو اک ہی پل میں
پیمائشِ جسمِ ناز کرلی میں نے

ہر نقشِ خیالات میں بکھرا میں نے
ہر موتی، تصور ہی میں رولا میں نے
کل اُس کی نگاہ سے بچا کر، اُس کو
نظروں کی ترازو میں جو تولا میں نے

جب اپنے خیالات کو ہانکا ہیں نے
پایا۔ جسے دیکھا اُسے بانکا ہیں نے
اِک غول حسینوں کا تھا بالکل عریاں
کل اپنے دماغ میں جو جھانکا ہیں نے

کچھ گنتی ہوئی عمر سے چھوٹی وہ تھی
پتے پہ کوئی بیر بہوٹی وہ تھی
چادر پہ خیالات کی برسے، کل شب
پیکر پہ لگا کے رنگ بوٹی وہ تھی

خوشبو ہی اگر آئے تو چکھ لیتے ہیں
نادر ہو تو دل میں اُسے رکھ لیتے ہیں
ہم حُسن خد و خال و قد و قامت کو
پرچھائیں بھی دیکھیں تو پرکھ لیتے ہیں

موتی جو ہیں سب رول چکی ہیں نظریں
محفل میں تجھے تول چکی ہیں نظریں
چپکی ہے تصوّر کی، یکایک تیرے
سب بندِ قبا کھول چکی ہیں نظریں

پرواز سے اطفال کے گو نا گوں ہیں
اطراف میں، چونٹی کے نہ نکلے ہوں ہیں
ان تیرے خطوط میں ہیں لیکن اے شوخ
یہ میرے خیالات مقید کیوں ہیں!

گم ہوں میں ترے حسن کی رعنائیوں میں
ہوں غرق ابلتی ہوئی انگڑائیوں میں
اور میرے تصور کی ہے گردش جاری
تیرے تنِ شفاف کی گولائیوں میں

خوشبو بھی اگر آئے تو چکھ لیتے ہیں
نادر ہو تو دل میں بھی اُسے رکھ لیتے ہیں
ہم حسنِ خط و خال و قد و قامت کو
پرچھائیں بھی دیکھیں تو پرکھ لیتے ہیں

جو حسن کے بانکے ہیں وہ کیسے ہونگے!
جو زاویے ہر سو ہیں وہ کیسے ہونگے!
اک رُخ بھی جو دیکھیں تو سمجھ لیتے ہیں
ہم، اور جو پہلو ہیں وہ کیسے ہونگے

فانوس کی روشنی میں جھلکی پوشاک
اور جب تنِ شفاف سے ڈھلکی پوشاک
سائے ترے اعضا کے ترے اعضا پر
نظروں میں مری وہ بھی تھے ہلکی پوشاک

بے حد تھا کرم اُس کا رُخِ حال پہ رات
نظریں تھیں جوانی کے خد و خال پہ رات
فانوس کا زاویہ تھا ایسا، اُس کے
اِک گال پہ دن تھا تو تھی اِک گال پہ رات

نقاش نے، قرطاس سے رہ کر کچھ دور
کل، تیرے وجود کو جو سونپا بھرپور
اعضائے نمودار کی گولائی کے
بازو میں جو ظلمت تھی تو پہلو میں تھا نور

جس وقت کہ فانوس بجھایا میں نے
پھر تجھ کو بھی خلوت میں نہایا میں نے
ٹھہری ہوئی تیرگی میں، دھیرے دھیرے
محسوس کیا پھر ترا سایا میں نے

قرطاس پہ جب رنگ لگایا میں نے
خود اُس کی شباہت کو نہ پایا میں نے
وہ ویسی ہی ہو گئی جو دیکھا اُس نے
تصویر میں جیسا تھا بنایا میں نے

اِک شوخ کہ خورسند ہوئی تھی وہ خود
نقاش کی دل بند ہوئی تھی وہ خود
تصویر نہ بن سکی جو اُس کی جیسی
تصویر کے مانند ہوئی تھی وہ خود

تصویر جو کل اُس کی بنائی میں نے
کچھ فرق تھا جب اُس کو دکھائی میں نے
تصویر کے ہو گئی مطابق وہ خود
اُس شوخ میں اچھی بات پائی میں نے

تصویر میں ملتی نہیں صورت تیری
تصویر میں کچھ اور ہے رنگت تیری
تصویر کے تو خود ہی مشابہ ہو جا
تصویر میں گر نہیں شباہت تیری

دکھلا تیرا اک جو تکمہ تو نے کھولا اے شوخ!
بارش سی ہے اک الماس کی چہرہ اے شوخ!
سینہ ترا آنکھیں سا نظر آتا ہے
مجرم کو سمجھ رہا ہوں چشمہ اے شوخ!
ہاں اوج پہ حسن ہے حسینہ تیرا!
ہاں رشکِ گلاب ہے یہ سینہ تیرا!
نیلا سلا ہے، ہوتا ہے جو تو
آنکھیں نظر آتا ہے یہ سینہ تیرا!
حسن تھا سامنے، روا مجھ کو تھی تشویش
بیدار کی، دھڑکے اک رہا تھا الغیش
سینے کی نہیں گولائیاں آنکھیں اور پھر
ابرو کے تلے بال تھے جیسے کہ ہو ریش
بازو کی طرح سینگ کا خم تھا گویا
سینہ تھا کہ آنکھوں کا تعلقہ گویا
جب بندِ قبا کھول کے انگڑائی لی
دھڑ کو دھوئے جیل کا تھا چہرہ گویا

ہم ہوں کہ ہو طفیلِ نجوم و مہ میں
کچھ بھی تو کھلے اسرار ہماری رہ میں
مینار کے ساکنو! نکل کر دیکھو
گنڈی میں ہے تو تھڑا گٹر کی تہ میں
سچائی کی وادی کے ہیں رہنے والے
ہیں جملہ نجاسات میں بہنے والے
رازِ عالمِ بالا کا نہیں کہتے ہیں
ہم تو ہیں گٹر کی بات کہنے والے
ہم نالے پہ کاٹتے ہیں راتیں، اے یار!
کیوں ہم سے یہ کر رہے ہو گھاتیں، اے یار!
ہم تو ہیں گٹر میں غرق، ہم سے مت چھیڑ
یہ کوثر و تسنیم کی باتیں، اے یار!
گٹر کے کناروں میں ہے جن کا مسکن
سچائی اور اُن کے درمیاں ہے چلمن
ہم گند کے نالے میں پڑے ہیں، ہم پر
ہے عالمِ بالا کی حقیقت روشن

مینار کے ساکنو! صداقت میں ہوں
جس سے تمہیں گھن آئے وہ حق بیں ہوں
یہ زندگی کیچڑ ہے تو اس کیچڑ میں
سارا ہی سنا ہوا ہوں، لت پت میں ہوں

خوابوں کے نظاروں سے نکل کر آؤ
گم نام ستاروں سے نکل کر آؤ
ہاں تم بھی، جہاں میں ہوں، گڑبڑ یعنی
مرمر کے مناروں سے نکل کر آؤ

کیا وقتِ سحر، شام ڈھلے بھی آؤ
گھنیاؤ گے، شاخوں کے تلے بھی آؤ
افسانوں کی شہ نشیں سے نکلو اک بار
نالے پہ حقیقت کے چلے بھی آؤ

جرأت کے مناظر ہیں سنبھل کر دیکھو
اس تنگ و طویل پل پہ چل کر دیکھو
کیا لطف میں حقائق کا ہے عالم اک بار
تم خواب کی دنیا سے نکل کر دیکھو

ہے ذوقِ جمال کو جگانے کے لیے
یہ جذبہ دلوں میں ہے سمانے کے لیے
کس سے کہوں! تصویر نہیں ہوتی ہے

میں خانۂ زردار سجاؤں کیسے!
افسانہ حقیقت کو بتاؤں کیسے!
موجود ہیں زندہ خار، آخر تصویر
ان کاغذی پھولوں کی بناؤں کیسے!
ہم اپنے ہی دل کا خون بہانے والے
اک نقشِ محبت ہیں بنانے والے
عزت گہِ زردار میں کھینچیں تصویر؟
ہم کوچۂ جاناں کے سجانے والے
خون اپنا بہانے کو ہے حاضر فنکار
اس بات پہ لیکن وہ نہیں ہے تیار
جا سوں جہاں کھیل رہے ہوں پتے
ہو ایسی کمیں گاہ میں اس کا شہکار
کر کے کوئی تدبیر نہیں کھینچنے کا
نقش ایسا یہ دیگر نہیں کھینچنے کا
رانی کی بناؤں گا کہ مہ وش وہ ہے
راجہ کی میں تصویر نہیں کھینچنے کا

سختی سے چٹانوں کی نہ ہمت ہارا
پھر موم سے بھی نرم تھا سنگِ خارا
چھوڑا وہیں فوارۂ آبِ شیریں
کل سنگ پہ پھاوڑا جو میں نے مارا

اجمال ہے، کیا اِس کی ضروری تفصیل
کی عقل نے، ایجاد کی روشن قندیل
اِک چوٹ ہتھوڑے کی جو کھا کر لوہا
نازک سی مشینوں میں ہوا ہے تبدیل

جب ہاتھ سے خود گلاب کھویا میں نے
کاندھوں پہ پھر اک پہاڑ ڈھویا میں نے
گر کچھ بھی نہیں ناگ پھنی تو ہوگی
صحرا میں چھوئی موئی کو بویا میں نے

وہ سامنے تیرے پھر ہے لوحِ صحرا
تعمیر پہ اب مُصر ہے لوحِ صحرا
اِک شہر کی تصویر بنا لے آ کر
نقاش کی منتظر ہے لوحِ صحرا

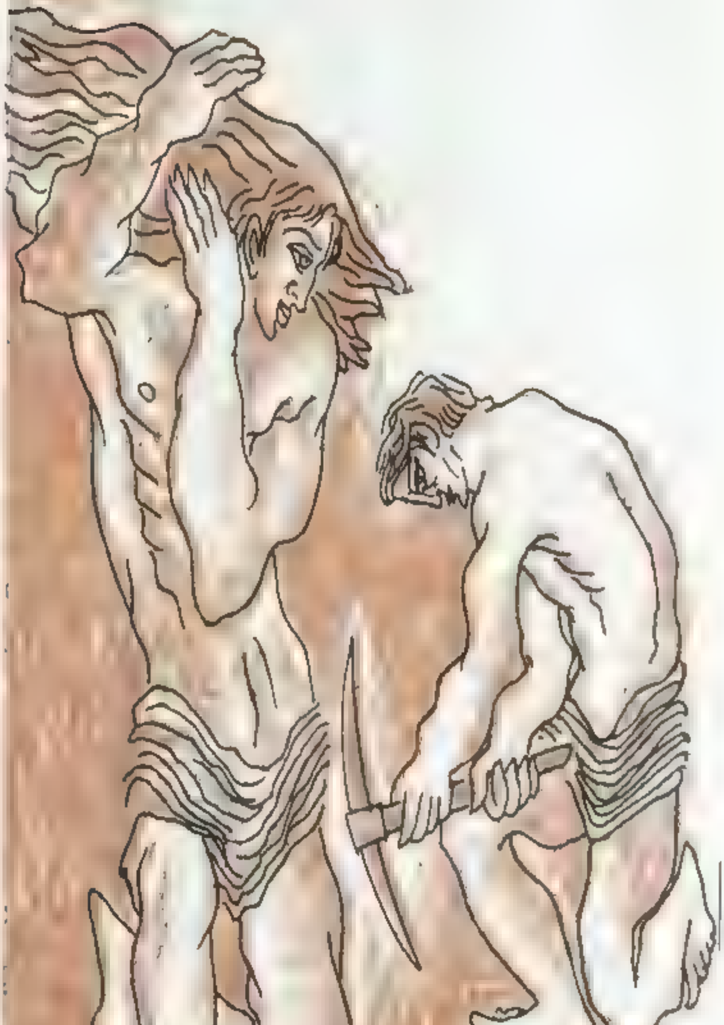

اس میں ہی مجھے طور نظر آتا ہے
یعنی کہ رُخِ حور نظر آتا ہے
اپنے اِسی بیلچے کے پھل کے اطراف
اِک ہالۂ پُر نور نظر آتا ہے

میں نے جو سرِ شام تھکا ہارا
افلاک سے پُل دیکھ کے اونچا تارا
رستہ تج کو تاکتی مشینیں نکلیں
جیسے ہی کُدال کو زمیں پر مارا

وہ سرو کے سلسلے کنارِ گلزار
ہیں خوب، مگر اُن سے ہیں بڑھ کر ضوبار
یہ تا بہ اُفق ہے جو کرینوں کا سماں
یہ حدِ نظر تک جو ہے کھمبوں کی قطار

کل شہر بیاباں میں نظر آئے گا
صحرا میں مرا دل نہیں گھبرائے گا
اور وہ جو ہے اِک سراب، اِک دن اس کو
اِک جھیل میں تبدیل کیا جائے گا

گل دان کے پانی میں یہ نازک بیلیں
صدمے جو جان کے ہیں کیسے جھیلیں،
کیوں رسے کریں جبر یہ بن سے کبھی دو
صحرا کے اندر یہ ناگ پھنی کے کھیلیں

تصویر تھی دیوار پہ شن کر حیران
گندھارا کے گوتم کے مگر سادھو گئے من
بولی کسی گل دان میں نازک ٹہنی
صحرا کے ہیں ناگ پھنی میں کچھ جان

گل دان کی بیلوں کو یہ بارا کب ہے!
منظور انہیں نام ہمارا کب ہے!
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی بھی ہو کر
جینا جو ہمارا ہے گوارا کب ہے!

اک بار یہ گل میں گیت تم نے گایا
سب کچھ ہی کیا چین نہ میں نے پایا
میرے تو خیالات بچارے کب ہے!
ہے پھیلا ہوا ناگ پھنی کا سایا

اس شہر کو جب پاس سے دیکھا میں نے
ہر شے کو بڑی یاس سے دیکھا میں نے
بانکی ہی تو نقش و رقِ بے بات پایا
جب شیشۂ احساس سے دیکھا میں نے

شاخوں میں ہے اک گرہ کشی کا انداز
کانٹوں میں ہے بھڑ کے کی آن کا انداز
اس شہر میں اب بھی وہی ہے تیور
صحرا میں ہے جو رنگ جینے کا انداز

واقف جو کہ ہیں دل کے غنی ہونے یارو
اک لقمہ کو کیوں کنگنی ہوں یارو
تم شاہ نشین میں ہو برا کیا جیون
صحراؤں میں بیراگ جینی ہوں یارو

رشتا نے رشتے جو ملا کر بیٹھے ہوں
خوش جھنگ کی کاوش میں تو بھی کر بیٹھے ہوں
گلدان میں ہیں کاغذ کے یہ پھول اب بھی
جنگل میں جو کیکر ہے وہ کیکر ہی ہوں

اُس دن سے لگا لیا ہے تالا مُنہ پر
اِک راز تھا آنے کو نرالا مُنہ پر
کہنے کو کبھی ہونٹ نہ کھولے لیکن
اب مکڑی کا بن چکا ہے جالا مُنہ پر

ڈر تھا کہ زمیں پر وہ گرے گا دھب سے
سر ہم نے ہلایا نہیں اپنا تب سے
بُت کی طرح جامد ہیں ہمارے سر پر
اُلّو نے ہے گھونسلا بنایا جب سے

ڈالے ہیں بھلا کس نے یہ گجرے سر پر
پھیلے ہیں مہیب سے اندھیرے سر پر
اِک ٹھنٹ پہ اُلٹی ہوئی ہنڈیا پہ ہے تاج
اِک زاغ ہے بیٹھا ہوا میرے سر پر

پھر پاؤں پہ گر کے آہ بھرتا میں ہوں
کہتا ہوں تری چاہ میں مرتا میں ہوں
خود کھیت میں اِک ٹھنٹ پہ ہنڈیا رکھ کر
پھر اُس سے ہی بڑھ کے عشق کرتا میں ہوں

ہونٹوں پہ جو لگے ہوئے تالے دیکھے
اجسام کے حالات نرالے دیکھے
اعضا کے جو ہیں خلا ہے اُن میں
مکڑی کے لگائے ہوئے جالے دیکھے

اِس کھیت میں غم سے مر رہا ہوں خود ہی
زخمی خود کو میں کر رہا ہوں خود ہی
کوؤں کے اُڑانے کو بنائی اک شے
میں نے، میں اُسی سے ڈر رہا ہوں خود ہی

اپنا ہوں گرو اپنا ہی چیلا میں ہوں
پرچھائیوں کا روکتا ریلا میں ہوں
خلوت کی پُراسرار سی تنہائی میں
سایوں کے ہجوم میں اکیلا میں ہوں

خود اپنے وجود کو دبوچا کیوں تھا!
خود اپنے ہی بازوؤں کو نوچا کیوں تھا!
خود اپنے ہی انفاس کو گن کر میں نے
خلوت میں یہ کیوں، یہ سوچا کیوں تھا!

وہ شوخ کہ میں جس کا ہوں دل سے قائل
ہاں پورے وجود سے ہوں جس پر مائل
گنجان بہت سی خاردار تاریں، لیکن
میرے اور اُس کے درمیاں ہیں حائل

میں خون میں ہاں لتھڑا ہوا پہنچا ہوں
زخموں کی میں تصویر بنے پہنچا ہوں
کانٹوں والے تھے تار جن سے ہو کر
میں منزلِ محبوب تک آپہنچا ہوں

محفل میں نہ ساقی نہ نگاریں دیکھیں
گلزار میں نکلا نہ بہاریں دیکھیں
جب بھی ہے نظر اُٹھائی میں نے اپنے
اطراف میں خاردار تاریں دیکھیں

دشمن ہوں وہ یا ہوں یار، میں نے دیکھا
کرتے نہیں اعتبار، میں نے دیکھا
افراد کے درمیان حائل یعنی
کانٹوں والے ہیں تار، میں نے دیکھا

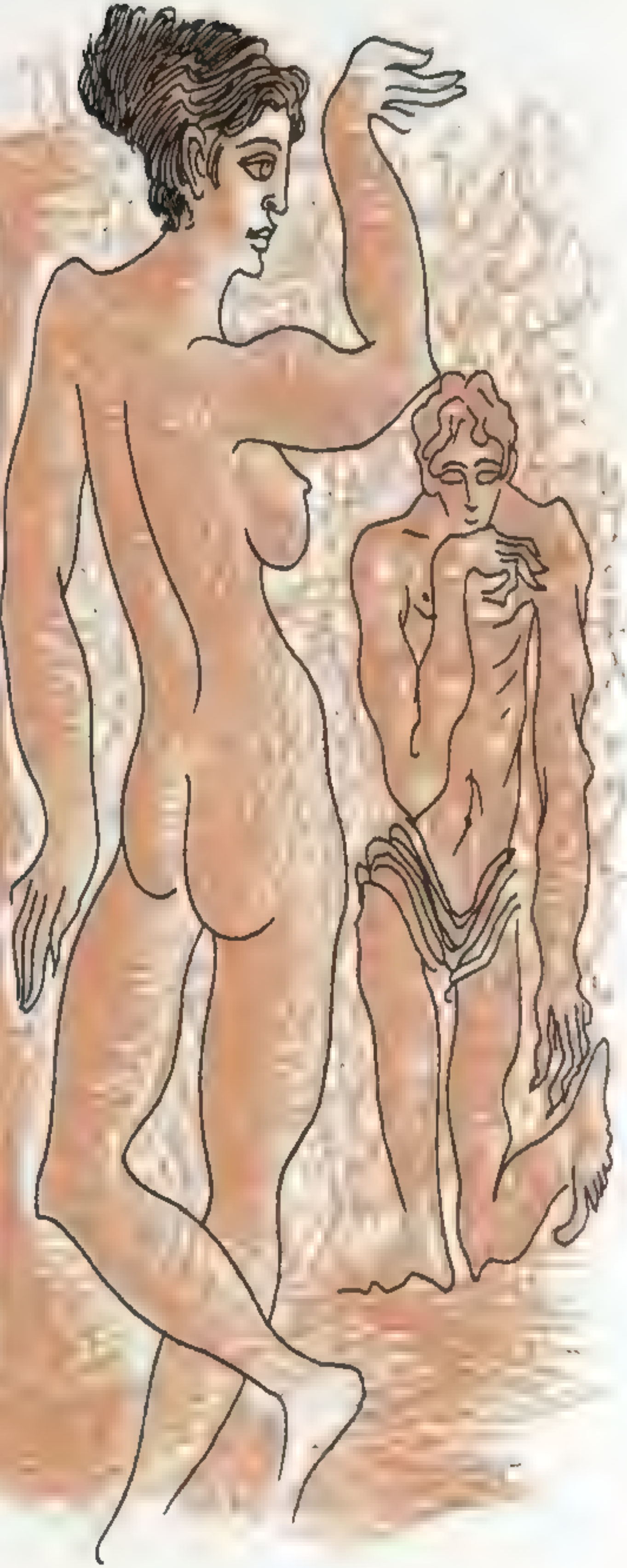

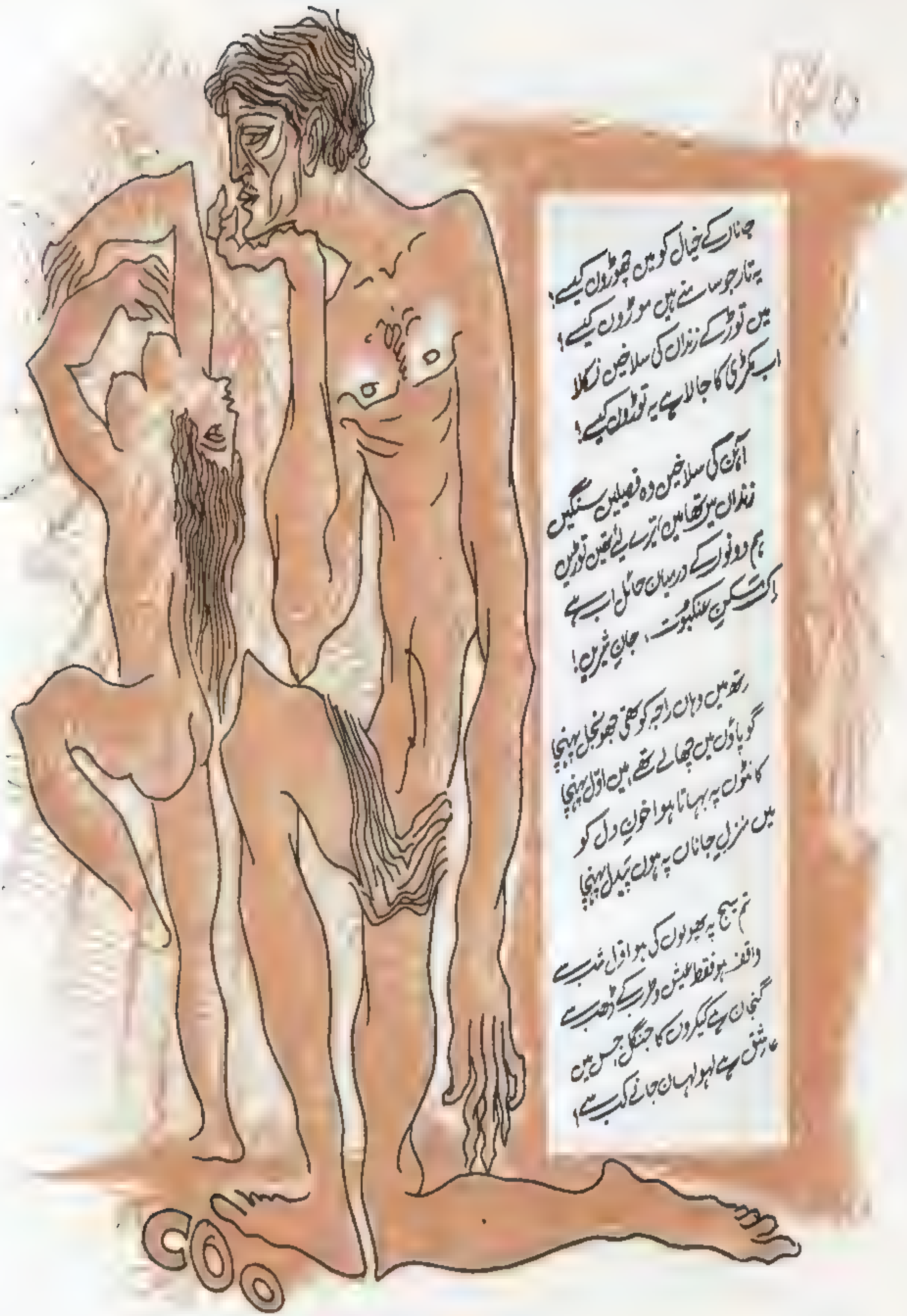

جاناں کے خیال کو میں چھوڑوں کیسے!
یہ تار جو سامنے ہیں موڑوں کیسے!
میں توڑ کے زنداں کی سلاخیں نکلا
اب مکڑی کا جالا ہے یہ توڑوں کیسے!

آہن کی سلاخیں وہ فصیلیں سنگیں
زنداں میں تھا میں ترے لیے تھیں تو ہیں
ہم دونوں کے درمیان حائل اب ہے
اک مسکنِ عنکبوت، جانِ شیریں!

رتھ میں وہاں راجہ کو بھی جو نجل پہنچا
گو پاؤں میں چھالے تھے، میں اوّل پہنچا
کانٹوں پہ بہاتا ہوا خونِ دل کو
میں منزلِ جاناں پہ ہوں پیدل پہنچا

تم سیج پہ پھولوں کی ہو اوّل شب سے
واقف ہو فقط عیش و طرب کے ڈھب سے
گنجان ہے کیکروں کا جنگل جس میں
عاشق ہے لہولہان جانے کب سے!

عزت کی پگھل جائے گی اِک دم زنجیر
مجھ کو وہیں مل جائے گی فوراً جاگیر
گر خونِ حسینؑ سے، محل میں جاکر
لوحوں پہ یزید کی بناؤں تصویر

اِنعام میں پھر دولتِ دُنیا پاؤں
ہیروں کے ہوں انبار جو واپس آؤں
تصویرِ سرِ حسینؑ کھینچوں اور پھر
خدمت میں یزید کی میں لیکر جاؤں

اِس خون کو اے صادقین! اور میں بیچوں!
اِس خون سے کشتِ چمن اور میں سینچوں!
کرنے کو یزید کی طبیعت کچھ خوش
تصویرِ سرِ حسینؑ اور میں کھینچوں!

جو بات نہیں دل میں، سناؤں کیسے!
جو نقش نہیں دل میں، بناؤں کیسے!
مقتل کو منقش کروں خونِ دل سے
دربار کو میں جا کے سجاؤں کیسے!

ہیں فیلِ ہوس پہ دل کو ہودہ کر لوں
سرسبز وہیں حرص کا پودا کر لوں
زردار کی گر دولتِ ناجائز ہیں
قرآں کی آیات کا سودا کر لوں

خطاط ہوں، مُعتبر مجھے ہے تشدید
اِک صورتِ رہبر مجھے ہے تشدید
زیر و زبر و نقطہ و پیش و مرکز!
تم سے بھی عزیز تر مجھے ہے تشدید

میخواری کہ عصیاں ہے گنہگار نزدیک
اور پاسِ مُصلّیٰ ہے ہمارے نزدیک
جس حرف پہ چاہیئے لگانا تشدید
بھولیں تو گناہ ہے ہمارے نزدیک

کرتی جو تمیز ہے تو وہ ہے تشدید
واجب جو جز ہے تو وہ ہے تشدید
زیر و زبر و پیش ہیں، سب سے بڑھ کر
مجھ کو جو عزیز ہے تو وہ ہے تشدید

ہاں سمجھا ہے جن کسی کو دیکھا میں نے
تجھ تک جانے کا اک وسیلہ میں نے
اے شوخ! ترے واسطے، تیری خاطر
کتنے ہی حسینوں کو ہے پوجا میں نے

انداز میں ہاں جھوم رہی تھی اپنے
پھر ہاتھ وہ خود چوم رہی تھی اپنے
کہہ کر کہ "مدار پر نہ گھومو" مجھ سے
محور پہ وہ خود گھوم رہی تھی اپنے

تم سے ہوں میں مختلف قرینے والا
ہوں اور ہی انداز سے جینے والا
پیمانۂ "پنٹور" میں سوڈا تو نہیں
شمپین کٹورے میں ہوں پینے والا

ہر دل کے بکھرنے کو دل جو کھولا
ہر شخص "یہ تھنڈرے ہیں" اتنا بولا
اُس بزم میں ہم خونِ جگر لائے ہیں
سب کو جہاں مرغوب ہے کوکو کولا

تاریخ بڑھی۔ وقتِ رواں کے بن میں
راہوں میں گڑھے کھودے ہیں پاگل پن میں
جس طاقتِ رجعت نے اُسی کے تو خلاف
ہے جنگ کا اعلان ہمارے فن میں

دونوں ہی بلند ہیں تو دونوں ہی ہیں پست
دونوں کا برا حال ہے، دونوں ہی ہیں مست
موضوعِ سخن مجھ میں سمائے ہیں خود بھی
موضوعِ سخن میں ہو گیا ہوں پیوست

یہ تا بہ اُفق ناگ پھنی کا جنگل
میں اِس میں سنا رہا ہوں کب سے منگل
گملے کی شاخوں پہ کہیں بیٹھ کے تم
ہو دیکھتے اک سُود و زیاں کا دنگل

گر ترکِ محبت کی جزا ہیں توڑے
گر جرمِ محبت کی سزا ہیں کوڑے
کوڑے ہمیں منظور ہیں مگر دل میں
سرطانِ جمود کے ٹیسیں گے پھوڑے

سچ چوراہے پر ننگا ناچ

تہ میں جو حقیقت ہے بتاتی ہے مجھے
عبرت کے مقامات دکھاتی ہے مجھے
چوراہے پہ پردے کی وہ بن کر تبلیغ
برقع میں برہنہ نظر آتی ہے مجھے

دیکھا جب مجھے وہ بولے یہ سینہ شق ہے
مجذوب ہے، مجنوں ہے، مستغرق ہے
یہ کون قلندر ہے کہ آگے بڑھ کر؟
باطل سے جو ماحول میں کہتا حق ہے

ہوں کفر کے دربار میں بڑھنے والا
باطل کی ہوں دیوار میں پڑھنے والا
ہیں اور کہیں تو کیا یہ حق کا کلمہ
ہوں زندگی کی رن میں پڑھنے والا

مسند پہ کتاب دین رکھی تھی، اک پیر
اخلاق پہ کر رہا تھا کب سے تقریر
پھر پیر نے بھی مسند کو وہیں سے کاٹا
مسند کے تھی نیچے جہاں ننگی تصویر

کچھ ہم کو منافقوں سے شکوہ کب ہے
اُن سانچے سے البتہ ہے، روز و شب ہے
جس سے کہ یہ کردار ہیں ڈھل کر نکلے
اِک جنگ معاشرے سے اپنی اب ہے

جائز نہیں، اے اہلِ مدینہ! ہے حرام
پوشاکِ علم بنک کا سینا ہے حرام
خود اپنے لبادے میں چھپا کر بوتل
اور وارے یہ کہتا ہوں کہ پینا ہے حرام

جو نیک تھا وہ کام دکھایا میں نے
جس کو نہ تھا مرعلوم بتایا میں نے
اور جو برے کرتوت تھے اُن کو اپنی
دستارِ فضیلت میں چھپایا میں نے

ہے ہاتھ میں تسبیح، زباں پر تکبیر
اخلاق پہ کرتا ہوں مدلل تقریر
پردے کی میں کر رہا ہوں کب سے تبلیغ
سینے سے لگائے ہوئے ننگی تصویر

سب سمجھے کہ ایمان ہے میرے دل میں
گو اُس کا ہی فقدان ہے میرے دل میں
اللہ ہی اللہ ہے میرے لب پر
شیطان ہی شیطان ہے میرے دل میں

ظاہر میں تو میں باندھنے صف آیا ہوں
باطن پردے میں شمشیر بکف آیا ہوں
ہوں کفر کا جاسوس، منافق بن کر
میں خیمۂ ایماں کی طرف آیا ہوں

لالچ کے گڑھے میں نے اُلیچے کیا کیا
کھولے ہیں ہوس کے بھی دریچے کیا کیا
یہ کس کو ہے معلوم، مجھے ہے معلوم
ہاں میری مسند کے ہے نیچے کیا کیا

جو داغ تھے دل، رات چھپائے میں نے
گندے تھے جو حالات چھپائے میں نے
تقدیس کی گفتگو کی چادر لے کر
دامن کے نشانات چھپائے میں نے

دل کو نہیں، چہرے کو نکھارے نکلا
دریائے ہوس کے پھر کنارے نکلا
حمام میں کچھ دیر رہا تھا جو وہ
درویش سج کا وہ دھارے نکلا

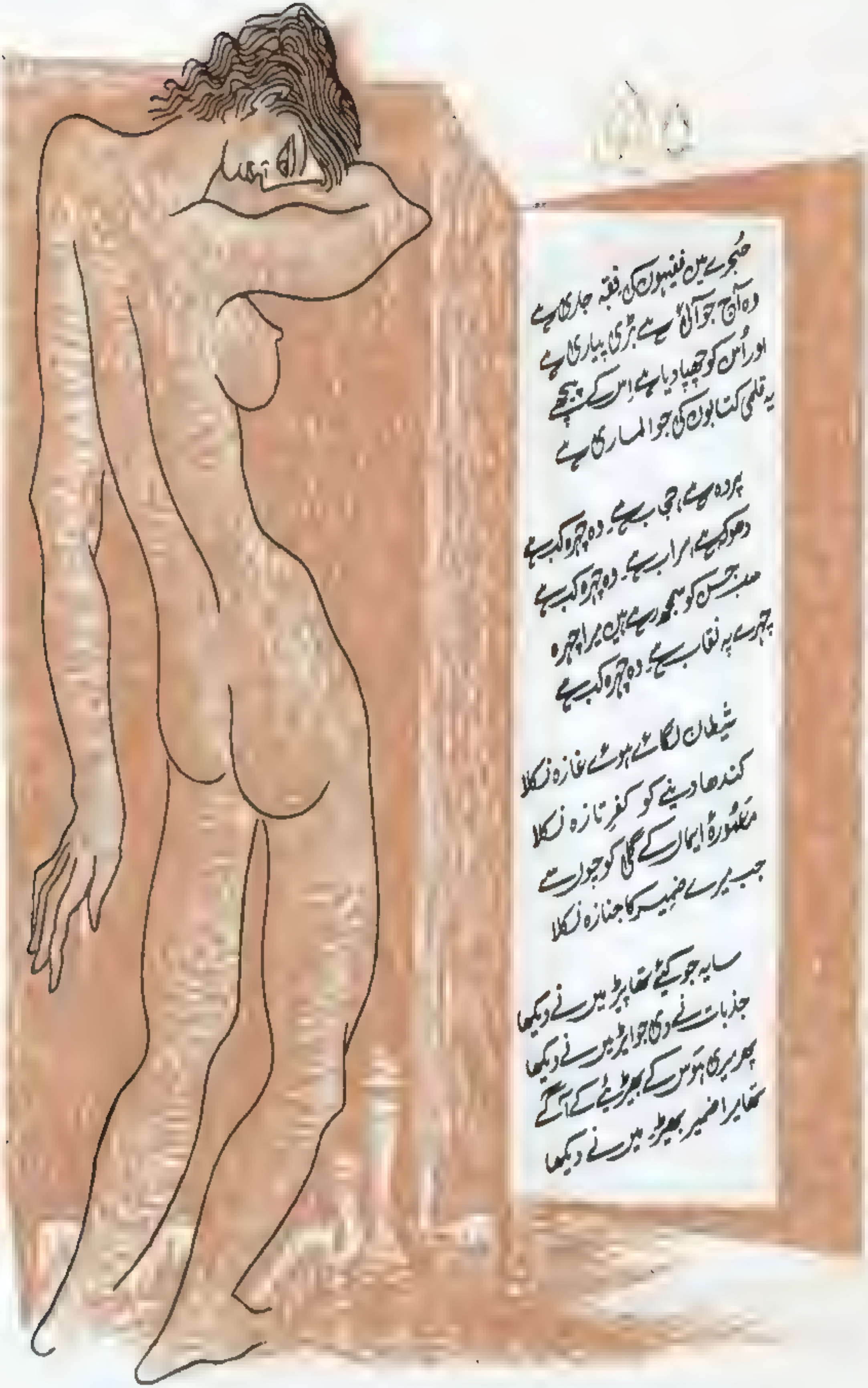

حجرے میں فقیہوں کی فقہ جاری ہے
وہ آج جو آئی ہے بڑی پیاری ہے
اور اس کو چھپا دیا ہے اس کے پیچھے
یہ قلمی کتابوں کی جو الماری ہے

پردہ ہے، حجاب ہے، وہ چہرہ کب ہے
دھوکہ ہے، سراب ہے، وہ چہرہ کب ہے
مطلب جس کو سمجھ رہے ہیں میرا چہرہ
چہرے پہ نقاب ہے، وہ چہرہ کب ہے

شیطان لگائے ہوئے غازہ نکلا
کندھا دینے کو کفر تازہ نکلا
معمورۂ ایمان کے گلی کوچوں سے
جب میرے ضمیر کا جنازہ نکلا

سایہ جو کئے تھا پیڑ میں نے دیکھا
جذبات نے دی جو ایڑ میں نے دیکھا
پھر میری ہوس کے بھیڑیئے کے آگے
تھا میرا ضمیر بھیڑ میں نے دیکھا

تم میں ہر اک اللہ سے ڈرنے والا
ایمان کے نام پر ہے مرنے والا
اس دورِ منافقت میں اک میں یارو!
ہوں کفر پہ اپنے ناز کرنے والا

ہے لبی اُس آستین میں شاطر پکا
اور میں کھلے بندوں کہ ہوں منکر پکا
تر پر ہے مرے جبل، بچاری میں ہوں
میں ڈنکے کی چوٹ پر ہوں کافر پکا

کہہ مسلکِ کفر میں ہے کچا کافر
دیتا نہیں ایمان کا غچا کافر
میری تو نظر میں ہے بہت ہی بہتر
اک جھوٹے مسلمان سے سچا کافر

ہر چند اُسے منکرِ یزداں پایا
اس پردۂ انکار میں انساں پایا
یعنی کہ منافق سے تقابل کر کے
کافر کو بھی اک بندۂ ایمان پایا

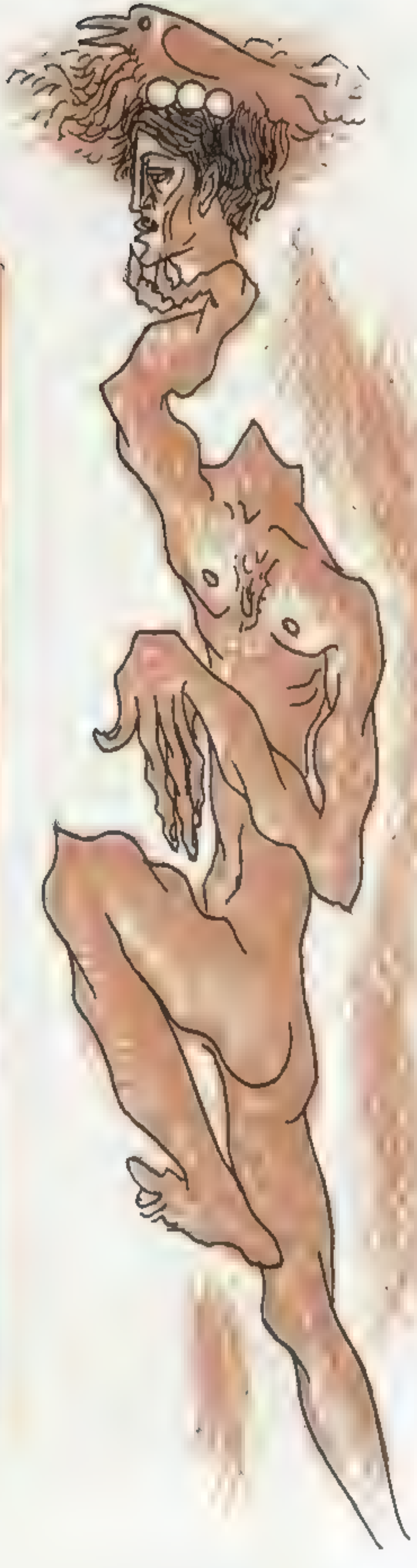

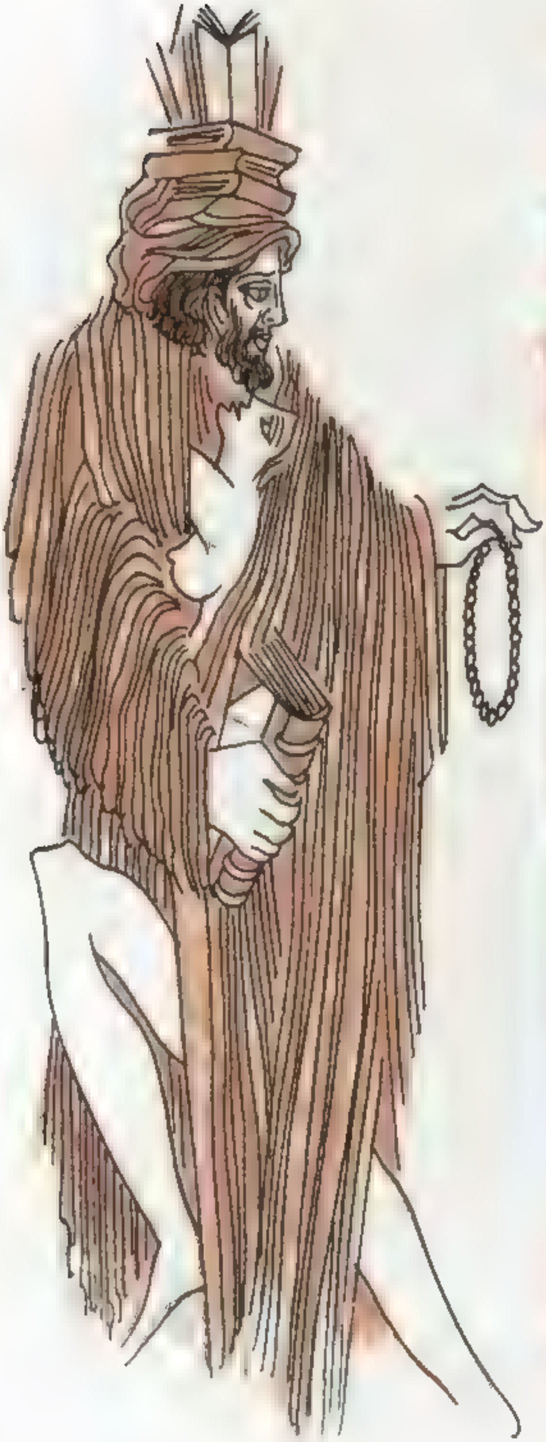

گو اپنے ہو ملبوس میں گم ، ننگے ہو
خلوت میں دبائے ہوئے دُم ننگے ہو
گر دیکھ سکو خود کو تو مجھ میں دیکھو
آئینہ اگر میں ہوں تو تم ننگے ہو

مٹکے ہوئے چلتے ہیں اُنگے ہم لوگ
ملبوس میں ہیں رنگ برنگے ہم لوگ
محفل میں ہیں پوشاک جو پہنے تو کیا
پوشاک کے اندر تو ہیں ننگے ہم لوگ

پے جامے ہیں پہنے جو ، ننگے وہ لوگ
محفل میں ہیں ڈھانپے ہوئے انگے وہ لوگ
میں بزم میں ننگا ہوں ، ہیں برہم مجھ سے
تنہائی میں رہتے ہیں جو ننگے وہ لوگ

خلوت میں تو اک نقشِ نجاست میں ہوں
اور بزم میں تصویرِ طہارت میں ہوں
تنہائی میں کرتا ہوں نہ جانے کیا کیا
محفل میں بڑا صاحبِ عزت میں ہوں

یہ خام رنگ ہی کا معراج ہے مذاق
ہاں خلقِ الٰہی کا معراج ہے مذاق
یہ میری برہنگی بھی جانے کیا ہے
جو خلعتِ شاہی کا معراج ہے مذاق
اک خار ہوں کلیوں میں برہنہ میں ہوں
[illegible] میں برہنہ میں ہوں
تہ خانوں میں [illegible] میں ہیں جو کشمیر کا
اس شہر کی گلیوں میں برہنہ میں ہوں
تم دیکھو ہیں مٹی میں مگن ہوں ننگا
ہیجان کے ہالے میں مگن ہوں ننگا
خلوت کے لمحوں میں [illegible] ہیں
پڑتے ہوئے ہالے میں مگن ہوں ننگا
تم خلوتِ گرم میں ہو سجنے آنا
[illegible]
[illegible]
چوراہے پہ میں ناچ رہا ہوں ننگا

یارو! یہ جو ہو خولِ نفاست پہنے
صورت پہ ہو اک اور ہی صورت پہنے
میں سطحِ وجود پر ہوں بالکل ننگا
اور تہ میں وجود کی ہوں خلعت پہنے

کیا تم سے کہوں میں بندگانِ سالوس!
کہدوں جو حقیقت ہے تو ہو گے مایوس
کمخواب کی پوشاک میں عریاں تم ہو
میں ننگا کہ ہوں ننگ میں اپنے ملبوس

میں بُو پہ ہوں، تم رنگ پہ نازاں یارو!
میں دُر پہ ہوں، تم سنگ پہ نازاں یارو!
تم اپنے لبادے پہ ہو، لیکن میں تو
ہوں اپنے فقط ننگ پہ نازاں یارو!

سچائی کو چمکارنے والا میں ہوں
اور جھوٹ کو للکارنے والا میں ہوں
پیچھے سے چھرا مارنے والوں میں یہاں
آگے سے چھرا مارنے والا میں ہوں

میں کمینے کے شہکار ہوں ننگا یارو
لکھ کر خطِ گلزار ہوں ننگا یارو
تم کونوں بچالوں ہی میں ہوتے ہو فقط
اور میں سرِ بازار ہوں ننگا یارو

موتی کو وہیں تاڑ کے ننگا ناچا
جھنڈے کو وہیں گاڑ کے ننگا ناچا
پھر سب سے بڑے چوک پہ سب نے دیکھا
کپڑوں کو میں جب پھاڑ کے ننگا ناچا

سوتے میں جگا رہی ہے تم کو دیکھو
کب تم ہو نبت رہی ہے تم کو دیکھو
چوراہے پہ یہ میری برہنہ حالت
آئینہ دکھا رہی ہے تم کو دیکھو

محفل میں جو شائستہ ہو پہنے انگا
اور کونوں بچالوں میں ہو کرتے دنگا
خلوت میں ہو تم لوگ برہنہ لیکن
چوراہے پہ اک میں ہی ہوں تنہا ننگا

اس شان سے میں تو مرتکب ہوں ننگا
ہاں ڈھیٹ ہوں اے اہلِ خرد! ہوں ننگا
اے بزم لبادہ پوش! تجھ میں اک میں
بالکل ہی برہنہ ہوں الف ہوں ننگا

کل دیکھا نہ جانے کہ بےڈھنگا دیکھا
اپنے کو شریف یا لفنگا دیکھا
یہ کون ہے اجنبی! یہ سوچا میں نے
کل خود کو جو آئینے میں ننگا دیکھا

جب بس نہ چلا ہار کے ننگا ناچا
ذہنوں کو میں للکار کے ننگا ناچا
رسوائی کے سامان تھے لیکن پھر بھی
میں بیچ میں بازار کے ننگا ناچا

چھلکے میں شرافت کے لفنگا تو ہے
اک پھول کے پردے میں پتنگا تو ہے
دیوار پہ ہر چیز نے میری مجھ کو
کل رات بتایا تھا کہ ننگا تو ہے

سب پہلو دکھا رہا ہوں اِک اِک کرکے
سب راز بتا رہا ہوں اِک اِک کرکے
جو میرے وجود پر ہیں پردے لاکھوں
میں اُن کو اٹھا رہا ہوں اِک اِک کرکے

ہر ناپ سے ہر تول سے باہر نکلا
میں جس میں تھا اُس غول سے باہر نکلا
جو خول تھے پہنے ہوئے میرے مجھ پر
جب توڑ کے میں خول سے باہر نکلا

گلدستے کی زیب آج ہیں خنجر وہ لوگ
ہر دور میں نسیم کے ہیں پژمردہ لوگ
ناراض ہیں۔ آپے سے جو باہر ہیں ہنوز
آپے سے نہیں اپنے جو باہر وہ لوگ

خوبوں کا جو بے نقاب دھندا کر دے
اخلاق کے بھاؤ کو جو مندا کر دے
ہے ساری کی ساری مچھلی سے پیاری مجھ کو
وہ مچھلی جو تالاب کو گندا کر دے

دن رات ٹوٹتا ہوں کبھی چنتا
میزان میں تولتا ہوں کبھی چنتا
تم اوروں کی کھولتے ہو پولیں اور میں
خود اپنی ہی کھولتا ہوں کبھی چنتا

دل میں ترے چھالا ہوں عجب بندہ ہوں
بالکل ہی نرالا ہوں، عجب بندہ ہوں
میں جھوٹ نہیں بولتا غم تو یہ ہے
سچ بولنے والا ہوں، عجب بندہ ہوں

سچ بات سُناتا ہوں عجب ہوں میں بھی
بَردوں کو اُٹھاتا ہوں عجب ہوں میں بھی
جو خود کی ہو تم بات چھپاتے۔ اپنی
میں وہ بھی دکھاتا ہوں عجب ہوں میں بھی

میں قول میں صادق ہوں عجب کیا میں ہوں
سچائی کا خالق ہوں یہ کیسا میں ہوں
میں اپنا ہی معشوق ہوں بالکل سچ ہے
اور اپنا ہی عاشق ہوں، یہ کیسا میں ہوں

٥٩

کر کے اُسے خود تلاش دیکھی ہوتی
کس طرح پڑی تھی، کاش دیکھی ہوتی
منظر وہ عجیب ہوتا، میں نے مر کر
خود اپنی اگر جو لاش دیکھی ہوتی

ہر روز ہی کرتا ہوں ستم اور غضب
ہو جاتا ہوں اک پیکرِ عصیاں ہر شب
جو کچھ خلوت میں کر رہا ہوں - یارو!
میں جھانک کے خود دیکھ رہا ہوں وہ سب

میں آپ ہی اپنی شکل کیسے دیکھوں
خود، خود کو نظر آؤں میں جیسے دیکھوں
میں اپنے ہی آپ کو ہٹ کے دیکھ کر
جیسے کہ کوئی اور ہے ایسے دیکھوں

اک زاویۂ راز سے دیکھا میں نے
شرمندہ تھا، کب ناز سے دیکھا میں نے
جیسے کہ کوئی اور ہے، کوشش کر کے
کل خود کو اس انداز سے دیکھا میں نے

تھا بند جو میں نے در کو مُڑ کے دیکھا
اپنے سوا کس بشر کو مُڑ کے دیکھا
تنہائی میں اِک گناہ کرتے ہوئے کل
کیوں میں نے اِدھر اُدھر کو مُڑ کے دیکھا

جب جسم میں طوفانِ بلا آتا ہے
دل عیش کی وادی میں چلا آتا ہے
کیوں ہوں میں گنہگار، سبب ہے ظاہر
کرنے میں گناہوں کے مزا آتا ہے

آئینے میں دیکھنے کی عادت اپنی
اب حد سے گزر چکی محبت اپنی
پانی جو نظر آئے تو فوراً جھک کر
میں اُس میں بھی دیکھتا ہوں صورت اپنی

ہاں شام و سحر سامنے آئینہ ہو
اِک ڈالوں نظر سامنے آئینہ ہو
سُولی پہ میں لٹک رہا ہوں کیا دیکھوں
سُولی کے اگر سامنے آئینہ ہو

کیوں اُتری ہُوا؟ کون ہے؟ میں نے پوچھا
مُوسیٰ ہے کہ فرعون ہے؟ میں نے پوچھا
آئینے میں کل عکس جو دیکھا اپنا
آئینے میں یہ کون ہے! میں نے پوچھا

میں کیا ہوں! یہ آئینے میں دیکھوں بالکل
پھر عکس نے برسے کہا! کہلوں؟ ـ بالکل
تو اور ہی کچھ ہے اُس سے جو کچھ تو ہے
اور میں ہوں کہ جو کچھ ہوں وہی ہوں بالکل

لاوا ہوں اُبل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں
ڈبنے سے اُچھل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں
میں خود میں زبردست ہوں اپنا پردہ
میں خود سے نکل پڑوں تو دیکھو کیا ہوں

اک تارِ خطرناک پہ چل کر میں نے
جلوہ جو کیا اپنا سنبھل کر میں نے
میں ڈر گیا جس وقت کہ خود کو دیکھا
کل اپنے وجود سے نکل کر میں نے

"دل ترا شتل ہے کہ تخمینے میں
بند ہوں کی شیشیں ہیں ترے سینے میں"
یہ بات مرا عکس کہا کرتا ہے
مجھ سے ہمارے قیمتی آئینے میں

نازش کے ترے دل میں ہیں ڈیرے کیا کیا
واقف ہوں کرتوت ہیں تیرے کیا کیا
ہاں مجھ سے لگاتار کہا تھا، تا دیر
آئینے میں کل عکس نے میرے کیا کیا

آئینے میں کل میں جو تھا ناظر اے عکس!
تو کتنا حسین کتنا تھا کافر اے عکس!
اُف کتنا میں چاہتا ہوں تجھ کو اور تو
اس حد کا ہے مجھ سے متنفر اے عکس!

حمام میں کل شام میں آیا جیسے
پھر میں نے لبادے کو اُتارا جیسے
آئینے میں یوں عکس نے گھورا مجھ کو
قابیل نے ہابیل کو دیکھا جیسے

جو کالے سپنوں لپٹے تھے بھنورے نکلے
اندر سے وہ ناگن کے اَدھورے نکلے
جب اپنے وجود کی درازیں کھینچیں
اُن میں سے ہوس کے کئی بھنورے نکلے

اُس در میں جو جھانکا تو بھی کچھ تھا اُجاڑ
گن ہو رہے گئے میں بھی تھا پہ نکلے جھنکاڑ
کچھ بھوت نکل پڑے تھے بالکل ننگے
کل اپنے وجود کے جو کھولے کیواڑ

خوں خوار چڑیل تھی جو منڈی دیکھی
بچے سے وہ کھولتی تھی گھنڈی دیکھی
جو میرے وجود کی ہے تہ میں اِک سمت
وہ کوٹھڑی جب کھول کے کنڈی دیکھی

اندر سے نکل پڑے تھے کتنے جنات
اِک غول چڑیلوں کا بلاؤں کی برات
جو میرے وجود پر پڑا تھا تالا
وہ میں نے اندھیرے میں جو توڑا کل رات.

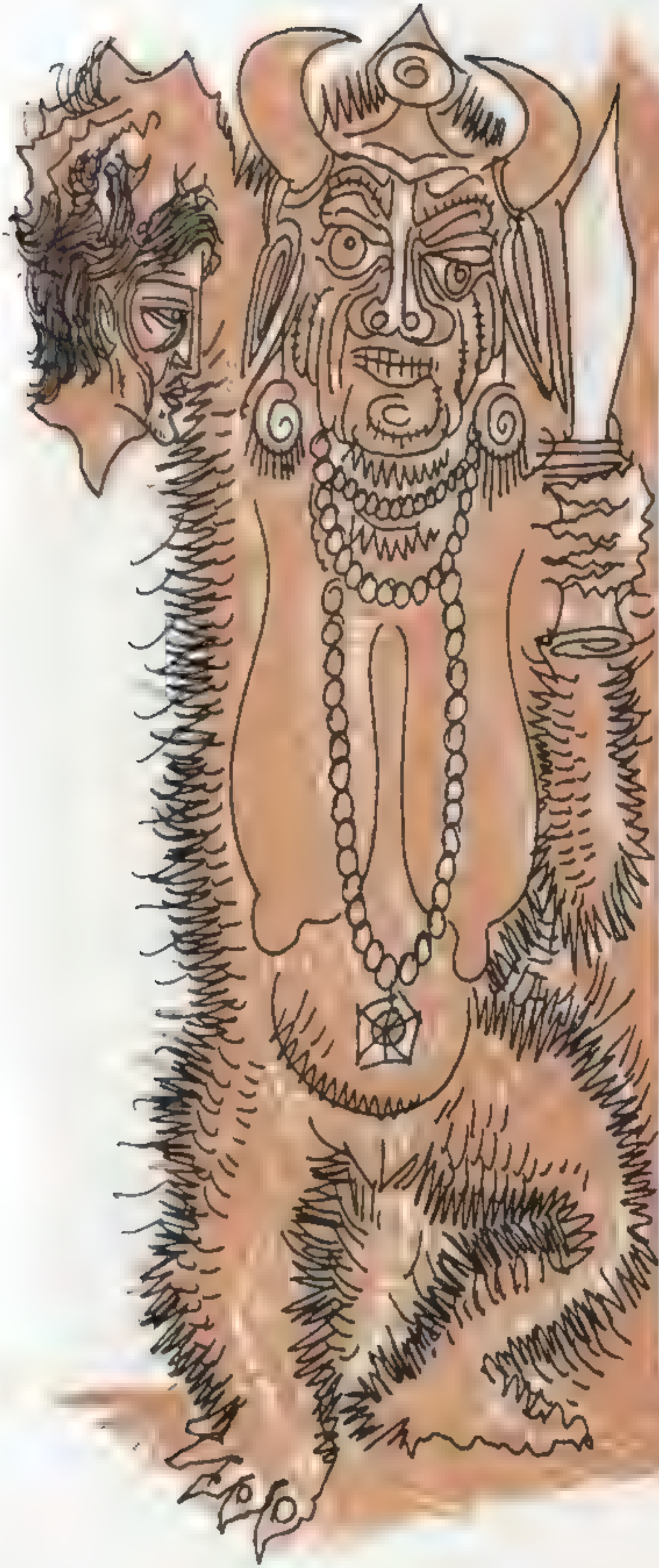

یہ سایہ ڈراؤنا اُبھرتا کیوں ہے
خونخوار ہے، رہ رہ کے بپھرتا کیوں ہے
"تو کون ہے" پوچھا تو یہ آئی آواز:
مجھ سے میں تری رُوح ہوں ڈرتا کیوں ہے

بھوتوں کی یہ چھاؤنی ہے۔ توبہ توبہ
کس حد کی گھناؤنی ہے۔ توبہ توبہ
جو پردۂ ذات میں ہے میرے وہ رُوح
اُف کتنی ڈراؤنی ہے۔ توبہ توبہ

میں نے اُسے ڈگڈگی بجا کر دیکھا
اُنگلی کے اشاروں پہ نچا کر دیکھا
اُف کتنی ڈراؤنی تھی۔ میں نے اپنی
کل رُوح کو۔ پردہ جو اُٹھا کر دیکھا

تھی دُور تو للکار رہی تھی مجھ کو
ناگن سی تھی پھنکار رہی تھی مجھ کو
"تو تو ہے مرا جسم" یہ کہہ کر اِک رُوح
پاس آئی تو چمکار رہی تھی مجھ کو

کل مجھ سے یہ دیو جرمن بولا آؤں
آسیب ہوس کی داشتہ سے ملواؤں
ہوتے ہی تعارف وہیں دیکھا میں نے
جنگل میں مری روح تھی ننگے پاؤں

اک حلقہ کیے ناچ رہے تھے جنات
تھا بیچ میں میں خود سے ہی کرتا ہوا بات
معمورۂ گمنام کے چوراہے پر
خود اپنے ہی آپ سے ملا تھا کل رات

جب دیکھی میں جس میں تھا بھاری میں نے
اُس میں سے جو ذات اپنی اُتاری میں نے
بجلی سی جھلک دیکھ کے اپنی، خود ہی
ویرانے میں اک چیخ تھی ماری میں نے

گر ریشمیں پردے کے اُدھر جائیں گے
خوں خوار بلا دیکھ کے مر جائیں گے
جو مجھ میں قیامت کی کشش پاتے ہیں
دیکھیں جو مری روح تو ڈر جائیں گے

گونجی یہ صدا گنبدِ ہستی ایسی میں ہوں
کون ایسی خطرناک کہ جیسی میں ہوں
خوں خوار چڑیل تھی جو بڑھ کر بولی:
ہاں دیکھو تری روح ہوں کیسی میں ہوں

چاروں طرف اک چھلانگ بھرتی عریاں
غائب ہو ہو کے پھر ابھرتی عریاں
کل رات خود اپنی روح دیکھی میں نے
صحرائے ہوس میں رقص کرتی عریاں

سمجھا تھا تصور میں تو بانکا میں نے
جب دیکھا تو ڈرتے ہوئے جھانکا میں نے
اک روح نظر آئی بڑی ہی گندی
کل اپنے وجود میں جو جھانکا میں نے

ساجد کا نہ مسجود کا عالم دیکھا
عابد کا نہ معبود کا عالم دیکھا
کل پردۂ دل، دل سے اٹھا کر دل میں
بھوتوں کی اچھل کود کا عالم دیکھا

میں کیا ہوں انجیل سمجھنے والا
توریت کی تفصیل سمجھنے والا
آئینے میں عکس کو سمجھ کر قابیل
میں خود کو ہوں ہابیل سمجھنے والا

ہر مہرے سے جہاں بس میں کہاں ہے مجھ سا ایسا
جیسا نظر آتا ہوں، کہیں ہوں ایسا!
دایاں مرا بایاں ہے تو بایاں دایاں
آئینے میں جیسا ہوں نہیں ہوں ایسا

آئینے میں خود کو دیکھا بانکا میں نے
ہر دوں کا مگر توڑ کے ٹانکا میں نے
کتنے ہی گھناؤنے ارادے دیکھے
جب اپنے دماغ و دل میں جھانکا میں نے

اغراض کا لگتا ہوا تخمینہ ہوں
جو بد ہیں اُن اعمال کا گنجینہ ہوں
یہ بزم ہے حمّام تو اس میں یارو!
میں کچھ نہیں دیوار پہ آئینہ ہوں

ایجاد سے تیری ہے یہ بزم کر ایجاد
اس میں ہوا اک اور ہی جوہر ایجاد
ہوں جس میں نہ دائیں بائیں اُلٹے سیدھے
وہ آئینہ کرتا ہوں سکندر ایجاد

شہکار میں ہر رنگ نکھر آتا ہے
جو نقشِ حقیقت ہے اُبھر آتا ہے
یہ آئینہ ایسا ہے کہ دایاں جس میں
بایاں نہیں، دایاں ہی نظر آتا ہے

ہم دونوں کے بالکل تھے نمایاں کل ہاتھ
آئینے میں میرے عکس بایاں کل ہاتھ
میں نے جو بڑھایا تو جواباً اُس نے
فوراً ہی بڑھا دیا تھا دایاں کل ہاتھ

آئینے میں کس طرح سنورتا میں ہوں
اک عکس تمہارا ہوں اُبھرتا میں ہوں
ہے ذوقِ جمالِ دوست دگرنہ بالکل
جو کچھ کرتے ہو تم وہ کرتا میں ہوں

آئینہ تمام

ایماں ہو کہ دیں ہو نہ سوچا میں نے
ہیرا ہو کہ نگیں ہو نہ سوچا میں نے
یہ آئینہ کیسا ہے کہ جس میں خود کو
یوسف سے حسیں ہو نہ سوچا میں نے

۷

اس شہر میں آگ کی بارش کرنے
ہر چیز یہاں کی نذرِ آتش کرنے
اک پردۂ دوستی میں، تم کیا جانو
آیا ہوں خطرناک میں سازش کرنے

کب نگری کی قسمت کا نوشتہ سمجھے
سب لوگ مرا ان سے ہے رشتہ سمجھے
سو کام ہیں ایسے کیے کہ مجھ کو سب لوگ
جاسوس ہوں رحمت کا فرشتہ سمجھے

ہر اک سے مانوس ہوں، واقف کم ہیں
ان کے لئے منحوس ہوں، واقف کب ہیں
بستی کے مجھے راز بتانے والے
اسرار سے جاسوس ہوں، واقف کب ہیں

جاسوسی دکھانے کے لئے آیا ہوں
بستی کو جلانے کے لئے آیا ہوں
کہتا ہوں کہ میں آگ بجھانے والا
گو آگ لگانے کے لئے آیا ہوں

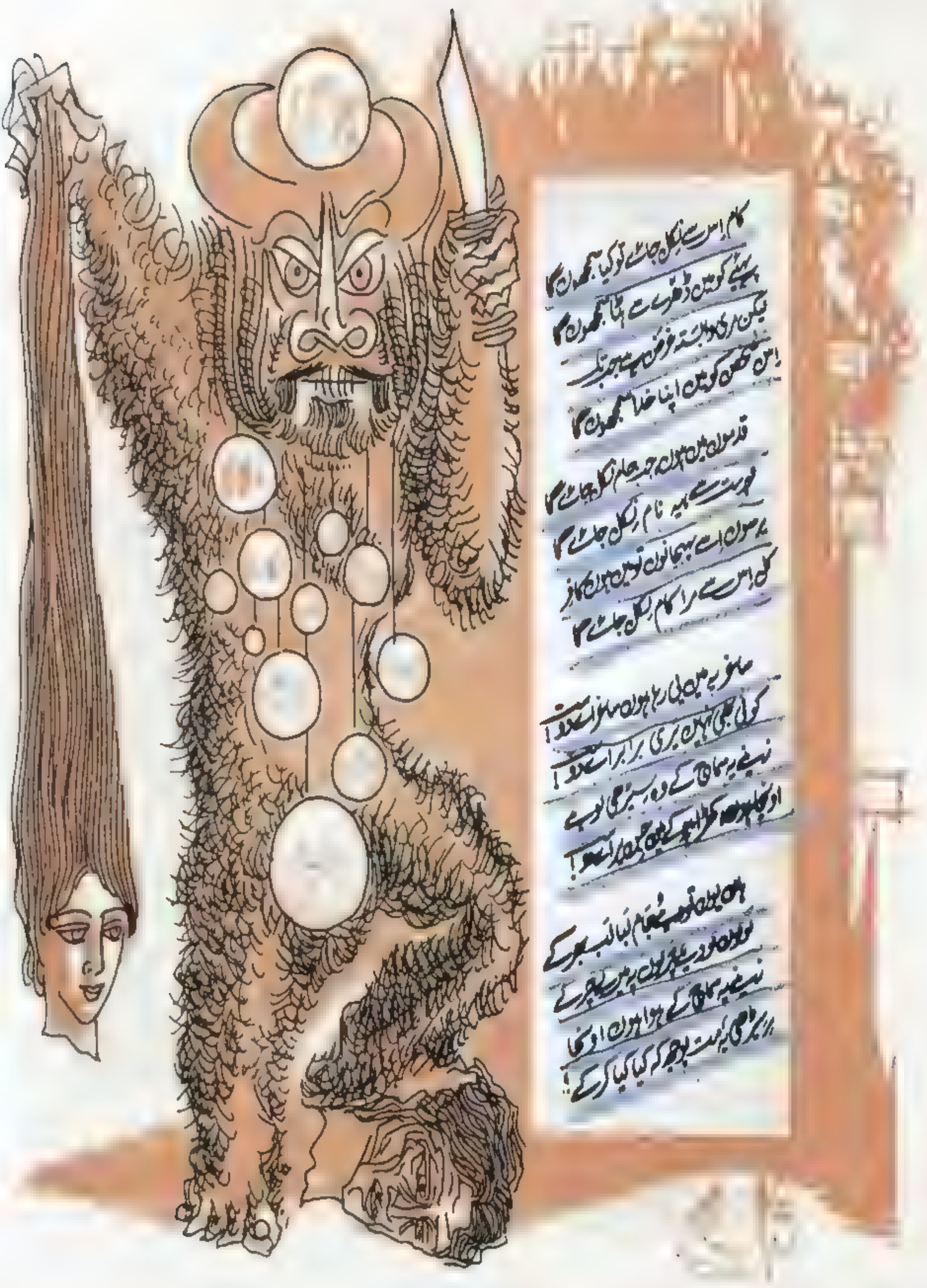
کام اس سے نکل جائے تو کیا سمجھوں گا
بیٹے کو میں ڈھڑے سے ہٹا سمجھوں گا
لیکن مری دلبستہ غرض ہے جب تک
اس شخص کو میں اپنا خدا سمجھوں گا
کل اس سے مرا کام نکل جائے گا
کوئی بھی نہیں بری برابر اسعد!
بند آنکھ کر کیا کیا کرے!

شیطان سے بلا کی جو بچالیں ہیں میں نے
لوگوں کی اُتاری ہیں جو کھالیں میں نے
شاطر ہوں قیامت کا چلی ہیں کیا کیا
اس پردۂ تہذیب میں چالیں میں نے

غم ہیں دلِ عشاق میں کیسے کیسے
عمال ہیں اس حلق میں کیسے کیسے
کرتوت دھڑلے سے کیے ہیں میں نے
اس پردۂ اخلاق میں کیسے کیسے

اس خلعتِ منصب میں جو کچھ میں ہوں
ہاں مخمل و کمخواب میں جو کچھ میں ہوں
خود سے بھی چھپا رہا ہوں تم تو کیا ہو
اس پردۂ آداب میں جو کچھ میں ہوں

جو کچھ ہے چھپا رہا ہوں چکر مت پوچھ
چکر پہ لگا رہا ہوں چکر مت پوچھ
اک پردۂ آداب کے پیچھے چمن میں
کیا کیا میں چلا رہا ہوں چکر مت پوچھ

دریاؤں میں روز جو کو جو دے کر پہنچا
میں کشتی کو منجدھار پہ لے کر پہنچا
سب اُس کو جو دیکھیں تو مجھے بھی دیکھیں
محفل میں کسی شوخ کو لے کر پہنچا

سب کو میں وہاں چہرہ دکھانے پہنچا
ہوں تاجر خوش ذوق بتانے پہنچا
میں فن کی نمائش میں، سمجھیں کیا رسلوم؟
لوگوں سے رہ و رسم بڑھانے پہنچا

لالچ کا لگائے ہوئے روگ آتے ہیں
نقصان کا کرتے ہوئے سوگ آتے ہیں
اک ایسے کلب کا بن گیا ہوں ممبر
جس میں کہ بڑے کام کے لوگ آتے ہیں

میں تاش کا ماہر ہوں، عجب فن یہ ہے
پھر سیکھ گیا ناچ۔ اب اُلجھن یہ ہے
پانی سے اگرچہ میں ہوں ڈرتا، پھر بھی
اب تیرنا سیکھوں گا کہ فیشن یہ ہے

آئے کوئی صوفے پہ بٹھا دیتا ہوں
جاتا ہوں نہانے کو "بتا دیتا ہوں"
حمّام میں پھر شور مچا کر، اُس کو
عاشق ہوں بچھڑن کا دکھا دیتا ہوں

محفل پہ عجب رنگ جمایا، کل شام
یہ چیز تو نادر ہے" بتایا، کل شام
میں نے کسی ٹھیکرے کو ثابت کر کے
زہرہ کی رکابی کا دکھایا، کل شام

تصویریں جو لے کے میں رد کرتا ہوں
اِس بات میں ترکیب کی حد کرتا ہوں
میں فن کو سمجھتا ہوں، یہ سب سمجھیں گے
بے چارے مُصوّر کی مدد کرتا ہوں

ننگی تو خوشامد سے تھی میں نے دہ گیر
لیکن بیبی کی شاہ نشین میں تقریر
نقاش کی دراصل مدد کرنے کو
بے چارہ پریشان تھا، خریدی تصویر

زیبا نہیں خود کروں جو اپنی توصیف
آئے کوئی کہتا ہوں کہ رکھئے تشریف
گندھارا کا کارِ حسن پہ گوتم لیکن
کرتا ہے مرے ذوقِ ہنر کی تعریف

اک زاویۂ راز سے دیکھی میں نے
اک فاصلۂ ناز سے دیکھی میں نے
نقش بھی سمجھ کر سمجھا ہی نہیں ہوں
تصویر کس انداز سے دیکھی میں نے

فن کار کو دو جام دیئے ہیں میں نے
ترکیب سے مانا کہ پیئے ہیں میں نے
سب دیکھنے آتے ہیں مکاں پر میرے
شہکار اکٹھے جو کیے ہیں میں نے

گندھارا کا گوشہ ہیں جو گوتم میں نے
رکھے ہیں انہیں کرنے کو کم غم میں نے
شخصیت سے کھنچتے ہوئے اصل یہ ہے
دل میں کیا ہلکا سا تبسم میں نے

نقصان کے ڈھانچے پہ کھڑا اک فائدہ ہے
کھودوں جو دفینہ ہے گڑا اک فائدہ ہے
ہر کام کا آدمی ہے واقف اس سے
میں دوستی کر لوں تو بڑا فائدہ ہے

بن ٹھن کے ہر اک بزم میں جاتا یوں ہوں
یہ سچ ہے کہ میں پیتا پلاتا یوں ہوں
کچھ اس میں بڑا فائدہ ہو جاتا ہے
لوگوں سے رہ و رسم بڑھاتا یوں ہوں

یاد آیا ابھی کہہ کے سنانا ہے مجھے
خود ہنسنا نہیں اُن کو ہنسانا ہے مجھے
بن ٹھن کے کتابوں میں لطیفے پڑھ کر
اک محفلِ گل رنگ میں جانا ہے مجھے

کی بات جو کچھ عام روِش سے ہٹ کر
ہر کوئی تھا پھر علم میں مجھ سے گھٹ کر
اک بزم میں کل گھر سے جو چلتے چلتے
پہنچا تھا میں دو چار مقولے رٹ کر

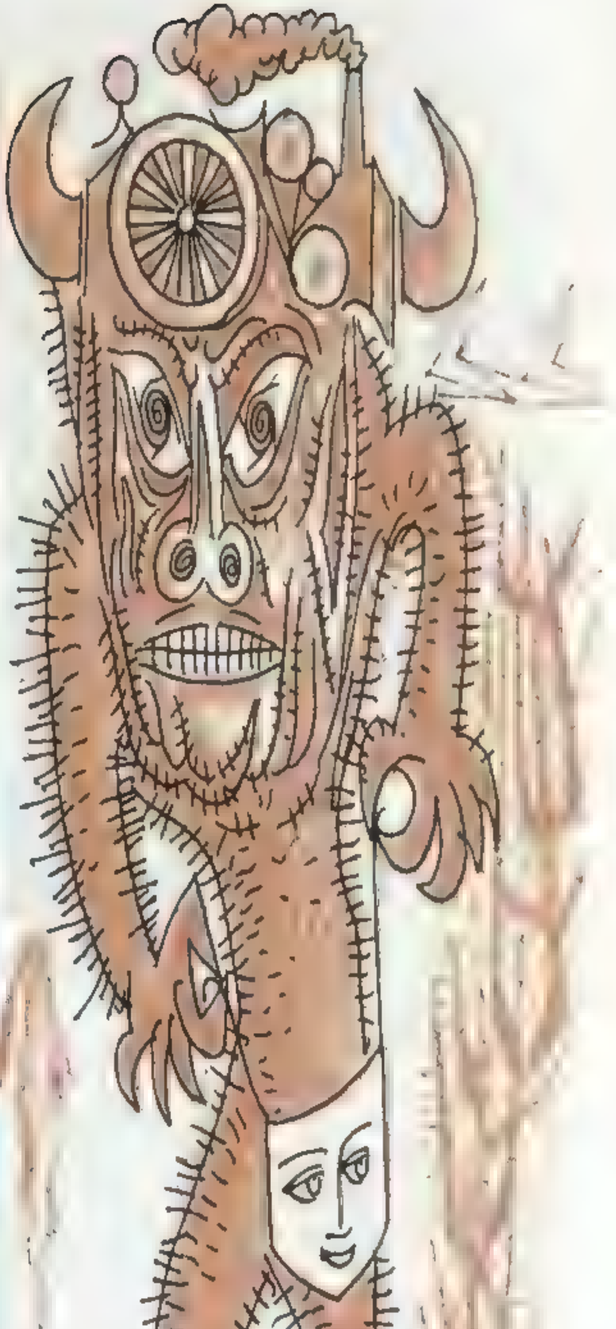

اُس بزم میں، کچھ مانگ کے پہنے پہنچوں
سب لوگ توجہ دیں میں جیسے پہنچوں
اُس میں تو بڑے کام کے لوگ آئیں گے
یہ فکر ہے مجھ کو کہ میں کیسے پہنچوں!

آئینے میں خود کو تک کے، میں بھی پہنچی
تھوڑی سی کریم مَل کے، میں بھی پہنچی
تھی محفلِ تاجرانِ برائے حمّام
کل اُس میں چمک دمک کے، میں بھی پہنچی

ہر کام میں اپنے آپ کر کے پہنچا
ہر چیز کی خوب ناپ کر کے پہنچا
اِک محفلِ خاص تھی کہ جس میں کل شب
میں خوب ہی ٹیپ ٹاپ کر کے پہنچا

میں بزم میں لگ رہا تھا کیسا، میں نے
جب پلٹا تو آئینے میں دیکھا میں نے
تو عکس ہے: کس کس کی اُتاری ساڑی
دل دل ہی میں تو نے! یہ سُنا تھا میں نے

اب جنسِ کشش کا تو یقیں اور بھی ہے
وہ شوخ نمائش میں حسیں اور بھی ہے
تصویر دکھاتا ہے مصوّر، مجھ کو
اور میری توجہ کہ کہیں اور بھی ہے

آیا ہوں نمائش میں، یہیں دیکھوں گا
جتنے یہاں آئے ہیں حسیں دیکھوں گا
تصویریں جہاں گھوم رہی ہوں زندہ
کاغذ کی میں تصویر نہیں دیکھوں گا

کل راہ جو گیری کی پکڑی میں نے
کب فن کی نمائش پہ نظر کی میں نے
ہر ایک حسینہ کو تو دیکھا، لیکن
واں ایک بھی تصویر نہ دیکھی میں نے

مجمع تھا میں حسینوں کے مجھے بھی لے جاؤ
یہ فن کی نمائش ہے، یہاں تو آؤ
ذکر جب نقشے والے سے کہا تھا میں نے
وہ اتنی حسین کون ہے؟ اُس سے ملواؤ"

تھی عشق کی تحریک تو میں نے پوچھا
پوشاک تھی باریک تو میں نے پوچھا
نقاش سے "تصویر کی قیمت کیا ہے؟"
اک شوخ تھی نزدیک تو میں نے پوچھا

تصویر وہ لایا جو بنا کر، مانگی
ہاں دوستی، کچھ اور بڑھا کر مانگی
سب کو یہ بتانے کو "خریدی میں نے"
تھوڑی سی مصور کو بلا کر مانگی

اُتری جو تھی آکاش سے، دی تھی تصویر
لیکر اُسی قلاش سے، دی تھی تصویر
اک کام کے آدمی کو، راضی کرنے
کل مانگ کے نقاش سے، دی تھی تصویر

اُس شوخ سے پوچھا جو بہت تھی طرار
"ہے کون پسندیدہ تمہارا فن کار؟"
اک نام بتایا تو کہا یہ میں نے
"اُس کے تو مرے گھر پہ کئی ہیں شہکار"

رُخ دیکھ کے ہاں غور سے کہنا ہے مجھے
سچ جیسے ہو، اِس طور سے کہنا ہے مجھے
"تم سے نہیں بڑھ کر کوئی دُنیا میں حسین"
کل کو بھی کسی اور سے کہنا ہے مجھے

سارے ہی نگاروں سے کہی ہے میں نے
ہاں جملہ ستاروں سے کہی ہے میں نے
"تم سے نہیں بڑھ کر کوئی دُنیا میں عزیز"
یہ بات ہزاروں سے کہی ہے میں نے

پہناتے ہوئے ہار، رہا یہ میں نے سوچا
ہر بات پہ ہر بار، یہ میں نے سوچا
جب میری محبت کا وہ کرتی تھی یقین
اچھا ہوں اداکار، یہ میں نے سوچا

نزدیک کے میخانے میں پی کر دو جام
اک دوست سے ملنے میں گیا تھا کل شام
وہ تو نہ تھا موجود لیکن اُس کی
خواہر نظر آئی تو مرا ہو گیا کام

جب اُس کے لیے لے کے گیا گلدستہ
اور شکریہ اُس نے جو کہا برجستہ
منزل پہ پہنچ جاؤں گا، شک ہی کیا ہے
منزل کا مجھے مل تو گیا ہے رستہ

اُس شوخ نے کل زلف پریشان کر دی
فوراً ہی مری بات پہ پھر ہاں کر دی
دنیائے مسائلِ عاشقہ میں جو تھی مشکل
اِک عطر کی شیشی نے وہ آسان کر دی

اِک دل کا میں مالک ہوں بتایا میں نے
موسیقی سمجھتا ہوں دکھایا میں نے
چڑیا کا غلام ہوں اور ایسا کرکے
ہے حکم کی رانی کو چھپایا میں نے

ہر شب کری سامانِ وفا باندھوں گا
زلفوں ہی میں پیمانِ وفا باندھوں گا
آج اِس سے تو کل اُس سے مگر برسوں کو
اِک اور سے پیمانِ وفا باندھوں گا

"شیریں! ترا فرہاد" کہا تھا کس سے!
"ہے عشق میں برباد" کہا تھا کس سے!
"میں تم کو کبھی بھول نہیں سکتا ہوں"
اب یہ بھی نہیں یاد کہا تھا کس سے!
کل جن کے قدم میں تھا رکھا دل میں نے
مانا، جنہیں آب و گل کا حاصل میں نے
خود اُن کے ہی کہنے سے اُنہیں پہچانا
وہ آج سے جب تو بہ مشکل میں نے
کہتا میں محبت سے تھا جن سے: "کافر!
تجھ سے جو بچھڑ جاؤں تو مر جاؤں گا پھر"
میں جن کے لیئے جان دیئے دیتا تھا
وہ کون تھی؟ کیا نام تھا اُس کا آخر!
مرمر کے مہینوں کا ہوا کیا آخر
اُن سارے حسینوں کا ہوا کیا آخر
جن سے کہ کئے میں نے تھے جھوٹے وعدے
اُن زہرہ جبینوں کا ہوا کیا آخر!

وہ اُن دنوں ارمان، نہ جانے کیا تھے،
محکم تھے کہ بے جان، نہ جانے کیا تھے!
سینے سے لگا کر جو کیے تھے اِک سے
وہ عہد، وہ پیمان، نہ جانے کیا تھے!

آتا ہے مجھے اِک اور حسیں ہے اب یاد
پہلے جو تھی محبوب کہیں ہے اب یاد!
مجھ کو یہ حقیقت ہے کہ اُس سے میرے
وعدے تو ہیں کیا، وہ بھی نہیں ہے اب یاد

ہیں نقش بروئے آب، اور نہ کیا ہیں!
خوش وقتی کا اک باب، اور نہ کیا ہیں!
صحرائے مسرت میں، میرے پیمان
کچھ ہیں تو فقط سراب، اور نہ کیا ہیں!

کوچے میں ہر اک در پہ نظر ہے میری
ہر دوست کی خواہر پہ نظر ہے میری
سب مجھ کو سمجھتے ہیں، سمجھتے ہیں شریف
ہمسائے کی دختر پہ نظر ہے میری

جگمگائے ہوئے گال پھر آ پہنچی ہے
مہکے ہوئے بال پھر آ پہنچی ہے
جس کو بڑی مشکل سے تھا ٹالا کل شام
وہ جان کا جنجال پھر آ پہنچی ہے

گلدستہ اس کے واسطے لائی کیوں ہے؟
بیٹھی ہوئی جم کے مسکرائی کیوں ہے؟
محبوبۂ موجودہ کی رہ دیکھتے ہیں
معشوقۂ سابقہ یہاں آئی کیوں ہے؟

اب اُس کی بڑی عجیب حالت کیوں ہے؟
اب مجھ سے محبت میں یہ شدت کیوں ہے؟
کل جس سے کہا تھا مری راحت ہے تو
وہ آج مرے سر پہ مصیبت کیوں ہے؟

ناراض نہ ہو جائے کچھ ایسے ٹالوں
اور ٹالنا لازمی ہے، جیسے ٹالوں
کل جس سے کہا تھا کہ تو لاثانی ہے
آج آئی تو ہے فکر کہ کیسے ٹالوں؟

جذباتِ وفا کی آرزو کرکے میں نے
رائی تھی، جسے پہاڑ کرکے میں نے
کیوں سر پہ یہ بے کار مصیبت لے لی!
اک شوخ سے چھیڑ چھاڑ کرکے میں نے

جو تھوک کر خود تھوکا ہے چاٹوں کیسے!
جو غار کر خود کھودا ہے پاٹوں کیسے!
کل جس کو یونہی "جانِ تمنا" تھا کہا
اب جان کا آزار ہے، کاٹوں کیسے!

کب اہلِ جہاں کی بات جھیلی میں نے
ناؤ جو غرض کی تھی وہ کھے لی میں نے
جب اپنے ہی محبوب سے، یہ تو کیا ہیں
جو چال خطرناک تھی کھیلی میں نے

جس شوخ کے گھر تھا کبھی آنا جانا
آپس میں نِگاہوں کا تھا تانا بانا
جس کیلیے خودکشی کی کوشش کل کی
آج اُس کو جو دیکھا تو نہیں پہچانا

اِس بستی میں اک اور نشہ ہے طاری
اک اور کو کہہ رہا ہوں "میری پیاری"
اور بھاگ کے جس شہر سے آیا ہوں وہاں
محبوبۂ سابق کے ہیں پاؤں بھاری

تھی گھومتی ہوئی مسلکِ فرسودہ میں
کب اُس کی جگہ اب دلِ آسودہ میں
معشوقۂ سابق میں نہیں تھی وہ بات
جو بات ہے محبوبۂ موجودہ میں

جب بھید کھلا کسی دلِ آسودہ کا
جب علم ہوا نامۂ آلودہ کا
"تم مجھ کو بھی بھولو گے" بجا ہے مجھ سے
شکوہ جو ہے محبوبۂ موجودہ کا

وہ ذکر کہ لاتی ہی نہیں ہے میرا
افسانہ، سناتی ہی نہیں ہے میرا
گو ہر کس و ناکس کے ہیں طعنے ہر دو
اور نام بتاتی ہی نہیں ہے

اب دل میں نہیں جس کا نشان، سُنتا ہوں
کچھ روز میں بننے کو ہے ماں، سُنتا ہوں
دس ماہ ہوئے، جس سے ملا تھا، وہ ماہ
اب اُس کو مہینہ ہے نواں، سُنتا ہوں

اب دل سے مرے نکلی ہوئی ہے وہ شوخ
اب سرکار سے دَر رو بنی ہے وہ شوخ
خود اپنے وجود میں چھپا کر سب سے
لغزش کو مری پال رہی ہے وہ شوخ

پہلے وہ ملاقات کی کوشش میری
پھر اُس کے وہ ٹالنے میں کاوش میری
آج، اُس کے وجود میں، جو بعد مدت
دیکھا، تو نمودار تھی لغزش میری

نو ماہ کی ہے بات کہ سر کو دھن کر
جس شوخ کو تحفے دیے میں نے چن کر
اُف کتنا میں ناچا ہوں خوشی کے مارے
آج اُس کی ہی خودکشی کی خبریں سن کر

معلوم ہے کیوں بال تھے میرے جیسے
واقف ہوں کہ کیوں گال تھے میرے جیسے
نالے پہ وہ ننھی سی جو جان تھی، اُس کے
بالکل ہی خد و خال تھے میرے جیسے

یاد آئی، وہ جو بات تھی مرے سے نکلی
کھولا جو اُسے کاغذِ تر سے نکلی
وہ میرے ضمیر کی تھی ہتک ہی کیا ہے!
ننھی سی جو اک لاش گٹر سے نکلی

پیمان تھے جھوٹے جو کیے تھے رہ میں
لایا تھا کسی شوخ کو اپنی شہ میں
اب میرے گناہ کی وہ زندہ صورت
لپٹی ہوئی بہتی ہے گٹر کی تہ میں

دُنیا کو بچاتے ہوئے تماشہ دیکھو
کانٹے میں مرے ہے جو وہ ماشہ دیکھو
نالے پہ پڑا، لپٹا ہوا چیتھڑوں میں
وہ میرے ضمیر کا ہے لاشہ دیکھو

میں داشتہ کے پاس اُٹھا کر اک جام
کمسن تھی وہ مرے بیٹھا رہا اور ہو گئی شام
گھر آ کے یہ زوجہ سے کہا تھک گیا ہوں
دفتر میں حسابات کا کرتے ہوئے کام

تبدیلیٔ موسم کے سبب اے مرے یار!
جیسے ہی ہوئی داشتہ میری بیمار
جو سستی دوائیں تھیں وہ جا کر بازار
خود لایا کہ یہ شب بھی نہ جائے بیکار

دو کوڑی کا ایمان تھا، ایمان دیا
اور خیمۂ مستی کو وہیں تان دیا
مَس کر ہی لیں میں نے وہ ملائم پوریں
اک دوست کی زوجہ نے جو کل پان دیا

میں ریشمیں پردوں میں سنورنے والا
ساغر اسٹے انگور سے بھرنے والا
میں اور محبت سرِ مقتل؛ توبہ
ہوں شاہ نشیں میں عشق کرنے والا

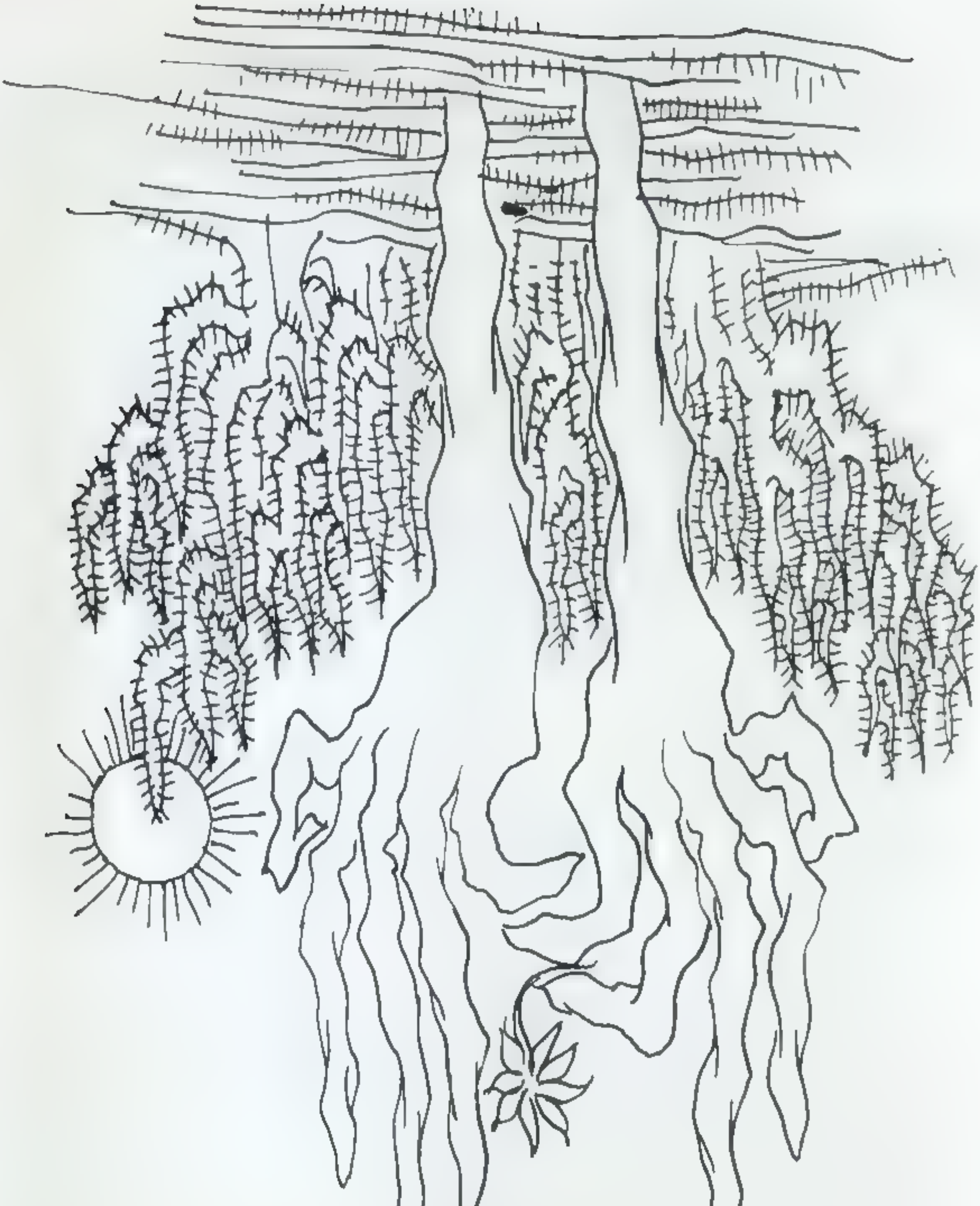

جہدِ حیات

پُر خار ہے جس دشت میں میں رہتا ہوں
ہر جھاڑی سے وابستہ میں آ اٹکتا ہوں
شک تھا تو اندھیرے میں ٹٹولا خود کو
میں میں ہوں کہ میں ناگ پھنی ہوں کیا ہوں؟

بستی کو ہیں چہکارنے والے ہم بھی
دل اپنا نہیں مارنے والے ہم بھی
طوفانِ حوادث جو سرے آتا، آئے
ہمت تو نہیں ہارنے والے ہم بھی

ہم ذائقۂ زیست کو چکھ سکتے ہیں
حالات کی نبضوں کو پرکھ سکتے ہیں
نازوں کے پلے ہیں، جو مصیبت آئے
کہسار کو ہم کاٹ کے رکھ سکتے ہیں

لادے ہوئے خود دار و رسن جاتے ہیں
باندھے ہوئے میدان میں کفن جاتے ہیں
ہم ہیں تو پرِ کاہ۔ ولیکن کب،
اٹھتا ہے جو طوفان تو بن جاتے ہیں

دل بحرِ وجود میں ڈبویا میں نے
جینے کی محبت ہی میں کھویا میں نے
کل پھول کا سایہ کہ تھا وزنی اور آج
شانے پہ پہاڑ کو ہے ڈھویا میں نے

مرغوب یہ زندگی کی مے ہے بانکپن
سینے سے لگا لی یہ شے ہے بانکپن
ہاں ٹوٹ پڑے مجھ پہ قیامت پھر بھی
ہر حال میں جینا یہ طے ہے بانکپن

جو اصل میں منزل ہے وہ جادہ یہ ہے
ہاں مجھ کو عزیز حد سے زیادہ یہ ہے
یہ ایک ہی زندگی ہے جیسے گزرے
میں اس کو گزاروں گا ارادہ یہ ہے

کب موقع ہے موقع کو میں تاڑوں گا
دامن پہ پڑے گرد وہیں جھاڑوں گا
کیسی ہی ہوا تیز بہت رہیں آئیں
میں اپنا گریبان تو نہیں پھاڑوں گا

کچھ دیر کو ہاں حشر اٹھا بھی دیں گے
جو نقش تعلق ہے مٹا بھی دیں گے
محبوبہ جو مر جائے تو دو اک دن میں
ہم یاد اسے کر کے بھلا بھی دیں گے

ہاں جملہ فنونِ زندگانی سیکھے
گرما کیسے کریں خون کو پانی سیکھے
صحراؤں میں ناگ پھنی سے جا کر
ہم نے یہ اصولِ سخت جانی سیکھے

بچھڑے ہوئے ہستی تو پٹ جائیں گے
ماحول سے ہم جنگ کیے جائیں گے
جب جلسے سوا اس کے شدائد ہوں گے
تو ناگ پھنی بن کے جیے جائیں گے

ہیرا جو نمو سے ہے تو کنی ہوں صحرا!
روئیدگی نیزہ تو انی ہوں صحرا!
ہاں شدتِ موسم کہ مظالم کر لے
میں بھی تو مگر ناگ پھنی ہوں صحرا!!

گمنام گگن میں جو رہا کرتا ہوں
محلوں کی میں نبض چھوا کرتا ہوں
صحرا میں جو ہے ناگ پھنی کا کردار
اس شہر میں اس کو میں ادا کرتا ہوں

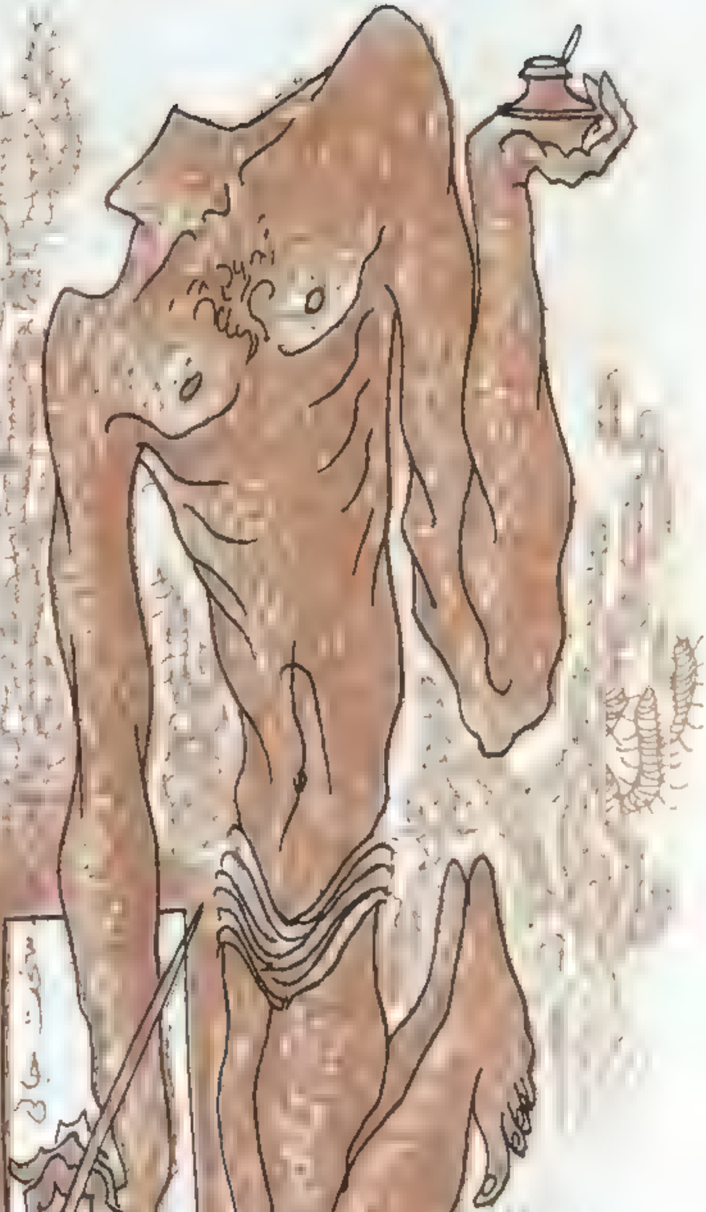

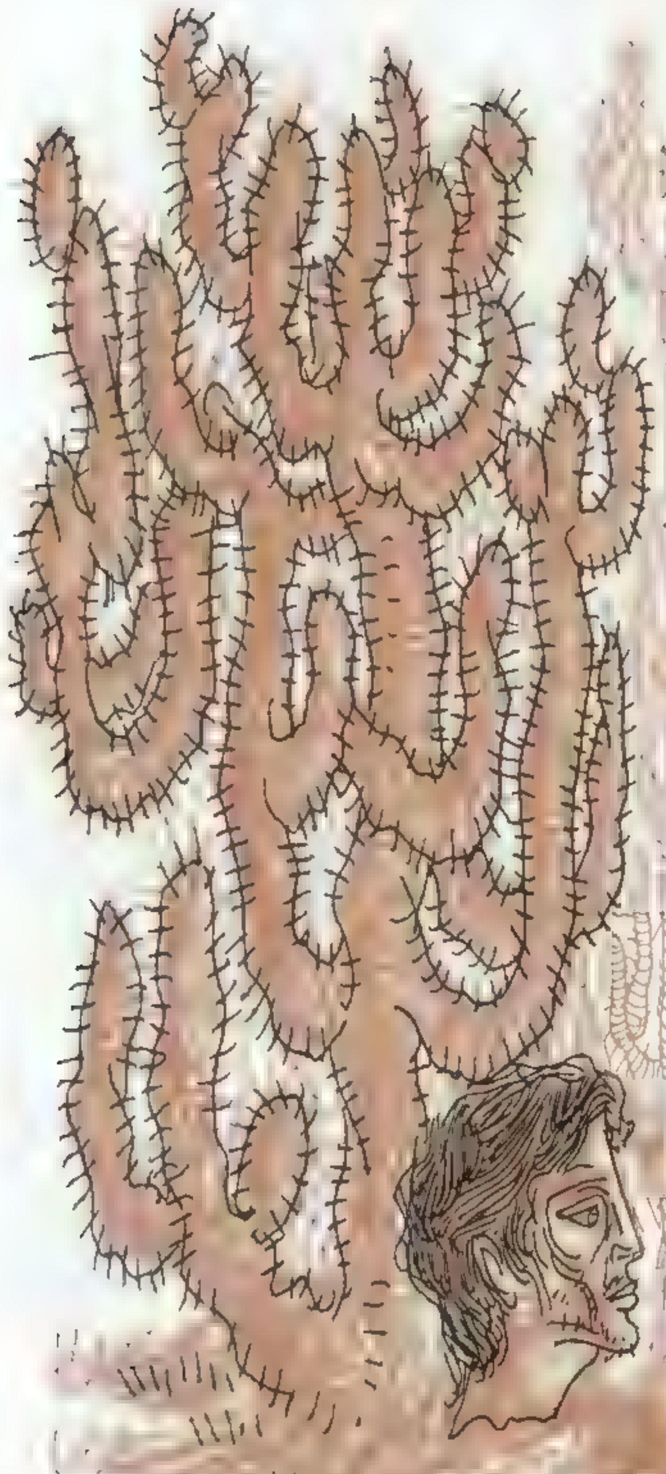

ماحول مخالف ہو، سبھی ہوں بے دین
موسم کے شدائد ہوں، زمیں ہو سنگین
پھواریں ہیں، حالات یہ ہوں تو آپ
پھر ناگ پھنی بن کے ہے جینا آئین

کس سے ہیں دبیں ناگ پھنی کی شاخیں
رکھتی ہیں یقیں ناگ پھنی کی شاخیں
ماحول کی سختی ہو بھی جتنی افزوں
اتنی ہی بڑھیں ناگ پھنی کی شاخیں

یوں ناگ پھنی کی تو نہ چھو لیں شاخیں
صحرا کی بہاریں ہیں چھو لیں شاخیں
ماحول مخالف کو ہے خطرہ لاحق
یا دل کو کہیں بڑھ کے نہ چھو لیں شاخیں

کیا کوہ ہے، ہاں کوہ کنی سے پوچھو
زرہ کسے کہتے ہیں اُنہی سے پوچھو
جینا کہ ہے اک جہدِ مسلسل، یہ راز
صحراؤں میں تم ناگ پھنی سے پوچھو

صحرا کی حرارت کو دکھاتا ہے مذاق
سورج کی تمازت کا بتاتا ہے مذاق
ہاں ناگ پھنی پھیل کے اونچی ہو کر
موسم کے مظالم کا اڑاتا ہے مذاق

یہ ناگ پھنی بولا کہ شرماتے ہیں
صحرا میں مجھے توڑنے جو آتے ہیں
قبل اس کے کہ میں ٹوٹوں یہ میرے کانٹے
دشمن کے وہیں ہاتھ میں چبھ جاتے ہیں

جانا ہے کہاں ناگ پھنی کو مت چھیڑ
ہاں بیٹھ یہاں ناگ پھنی کو مت چھیڑ
اک ذاتی تحفظ کے لیے ہیں کانٹے
صحراؤں میں ہاں ناگ پھنی کو مت چھیڑ

سب کچھ کرتا ہوں میں برائے ہستی
ہر حال میں رہتا ہوں فدائے ہستی
واقف ہوں کسی وقت نکل جائے گی
ہاں جسم میں یہ جو ہے ہوائے ہستی

رگِ گل کی ہوں، اہلِ کاخ! بچ کر رہنا
چھیڑو گے تو ہوں سلاخ، بچ کر رہنا
گر توڑنا چاہتے ہو مجھ کو۔ پھر میں
ہوں ناگ پھنی کی شاخ، بچ کر رہنا

پھر کیا، جو ہیں اہلِ شہر مجھ سے حیراں
وہ شاہ نشیں ہیں جو رکھے تھے گلداں
اور اُن میں وہ کاغذ کے چُنے تھے جو پھول
صحراؤں کے تھے ناگ پھنی پر خنداں

ہر حال ہی میں سانس لیے جاؤں گا
ہے زندگی اِک جام پیے جاؤں گا
گردن بھی جو کٹ جائے تو بے سر ہو کر
ممکن اگر ہو گا تو جیے جاؤں گا

پوشیدہ ہی رہ کر نہ ہویدا ہو کر
میں رہ گیا زندگی پہ شیدا ہو کر
پیدا تو میں ہونا ہی نہیں چاہتا تھا
مرنا بھی نہیں چاہتا پیدا ہو کر

مقتل نامہ

جب دل میں مرے معرفت کا پارہ چڑھتا
میں سجدے کو مقتل کی طرف ہوں بڑھتا
قالین پہ مرمر کی مساجد میں بھلا
جھاڑوں کے تلے نماز اور کیسے پڑھتا

جاناں کے قدم چوم کے آ پہنچے ہیں
ہم چاروں طرف گھوم کے آ پہنچے ہیں
غائب ہے کدھر؟ ہم سرِ مقتل جلّاد
لہراتے ہوئے جھوم کے آ پہنچے ہیں
معیار پہ دل اپنا پرکھ کر لائے
جو عشق کی لذت ہے وہ چکھ کر لائے
مقتل میں وہ جلّاد نہ بغلیں جھانکیں
ہم سر کو ہتھیلی پہ جو رکھ کر لائے
خود رکھ کے ہتھیلی پہ جو سر لایا ہوں
نصرت کا پھریرا ہوں کہ لہرایا ہوں
محبوب کے تخلیے میں جیسے پہنچے
اُس شان سے مقتل کی طرف آیا ہوں
ہم پر کرمِ حسن جو بے حد ہوگا
پر نور اگر عالمِ آمد ہوگا
گردن زدنی اس کی سزا ہے تو کیا
ہم سے یہ گنہِ عشق سرزد ہوگا

وعدہ جو کیا نورِ سحر سے میں نے
مقتل میں وہ ایفا کیا سر سے میں نے
جلاد کا کرنے کے لیے استقبال
چھڑکاؤ کیا خونِ جگر سے میں نے

مقتل میں بغاوت کا ترانہ میں نے
گایا۔ تو پھر اک نعرہ لگایا میں نے
قاضی نے مری آخری خواہش پوچھی
تو خنجرِ جلاد کو چوما میں نے

مقتل میں وہ مری شان جا کر پوچھو
عاشق کی وہ آن بان جا کر پوچھو
جلاد سے اُس کا تو یقیں کر لوگے
تھا کتنا میں سخت جان جا کر پوچھو

جلاد! یہ ایذا ہے گوارا ہم کو
بھاتا ہے یہ مقتل کا نظارا ہم کو
تو سایۂ خنجر میں جسے پوچھتا ہے
وہ راز تو گردن سے ہے پیارا ہم کو

اس شہرِ پُراسرار میں چُن کر مجھ کو
پھر ظلم کی دیوار میں چُن کر مجھ کو
حاکم نے وہ انصاف کی ٹانگی تصویر
دیوار پہ آثار میں چُن کر مجھ کو

دیوار کے اس رُخ پہ، محبت تعمیر
تیری۔ تو مجھے ملی، پڑی ہے زنجیر
حاکم کی تو داشتہ کی، بالکل عُریاں
دیوار کے اُس رُخ پہ ٹنگی ہے تصویر

اس سمت فقط زخم، فقط آہیں ہیں
واں جام ہیں نغمات ہیں اور باہیں ہیں
دیوار کے اُس طرف شور رنگین
زنداں کے در و غم کی طرف نگاہیں ہیں

مر جو پسِ دیوار دیا تھا میں نے
تھی ظلم کی، مسمار کیا تھا میں نے
یہ سوچ کے کہ دیوار میں رخنہ پڑ جائے
دیوار پہ سر مار لیا تھا میں نے

یہ دیوار کے پیچھے کوئی سازش کیوں ہے
اینٹوں میں یہ کس انداز کی جنبش کیوں ہے
آثار میں چن دیا ہے کس کو حاکم!
دیوارِ تشدد میں یہ لرزش کیوں ہے

محفل میں یہیں رکھ دو یہ ساغر دیکھو
عاشق پہ جو چل رہا ہے خنجر دیکھو
دیوار کو آگے سے تو دیکھا تم نے
دیوار کو پیچھے سے بھی جا کر دیکھو

دربار کی مصور سے جو مانگی تصویر
تو جملہ فصیلوں کو پھلانگی تصویر
حاکم نے وہ داشتہ کی بالکل ننگی
دیوارِ طرب گاہ پہ ٹانگی تصویر

مینا سے مئے ناب سے دہکتے رخسار
گلدان میں ہر پھول ہے نکھرے ہیں سنگھار
دیوار کے اس رخ پہ ٹنگی ہیں لاشیں
دیوار کے اس رخ پہ لگے ہیں تہوار

میرے نے کہ میں رہتا تھا میرے عشق پہ
پورے کیے، جو قول تھے جاناں کو دیئے
مقتل میں جو سر اپنا بنایا تھا پھر
اک رازِ محبت کے تحفّظ کے لیے

جلوہ نئے سانچے میں جو ڈھالا میں نے
اک پل کے لیے موت کو ٹالا میں نے
اپنے تنِ بے سر کو تڑپتے ہوئے جب
سر ہاتھ میں لینے کو سنبھالا میں نے

قاتل کی نظر پھر جو تھی خنجر پر
تو خون کی کچھ بھی نمی خنجر پر
سر کٹتے ہی، جب تن نے مرے رقص کیا
مقتل میں اڑی دھول، جمی خنجر پر

یہ گرم بغاوت کا جو گاڑھا خون ہے
جو پہلو سے مقتل کا وہ گوناگون ہے
سر کٹتے ہی میں تڑپا تو مرے تن سے
جلاد یہ بولا کہ تڑپ کیوں ہے

مقتل میں تھا جلاد، کلہاڑے پہ تھی سان
وار ہو کے بھی، جینے کا تھا مجھ کو ارمان
میرے تن سے سر نے وہیں پر بڑھ کر
ہاتھوں میں اٹھا لیا تھا سر کو اک آن

میں پھر بھی بغاوت میں تڑپ کر اٹھا
اک آگ سی تھی جس میں کہیں تپ کر اٹھا
سر کٹنے پہ بھی، پھر جوشِ محبت آیا
مقتل میں مرا جسم تڑپ کر اٹھا

میں غارِ جفا پاٹ رہا ہوں جلاد
ہستی میں مجھے آٹ رہا ہوں جلاد
میں دھار سے گردن کی یہاں مقتل میں
خنجر کو ترے کاٹ رہا ہوں جلاد

ہم تو ہیں کسی شوخ پہ مرنے والے
مقتل میں کسی سے کب ہیں ڈرنے والے
سر کٹنے سے بہتر ہے کسی بھی صورت
پیمانِ محبت نہیں کرنے والے

اُس نقش سے نمرود پہ خنجر کھینچا
آئینۂ سلطنت سے جوہر کھینچا
سر کٹتے ہی میرے تن نے جو تڑپ کر اک نقش
انگشت سے مقتل کی زمیں پر کھینچا

گو ہاتھ میں لرزش تھی وہیں پر لکھا
تھا خود جسے لوحِ یقیں پر لکھا
سر کٹتے ہی اک لفظِ محبت میرے نے
انگشت سے مقتل کی زمیں پر لکھا

پھر کیا ہوا جس وقت کہ بر ارضِ شام
جلّاد کے خنجر نے کیا کام تمام
انگشت سے مقتل کی زمیں پر لکھ
میرے تنِ بے سر نے تڑپ کر اک نام

لیکن وہیں مقتل کی زمیں پر توڑا
اِس پردے میں تاجِ زر و گوہر توڑا
میرے تنِ بے سر نے تڑپتے ہوئے جب
جلّاد سے کل چھین کے خنجر توڑا

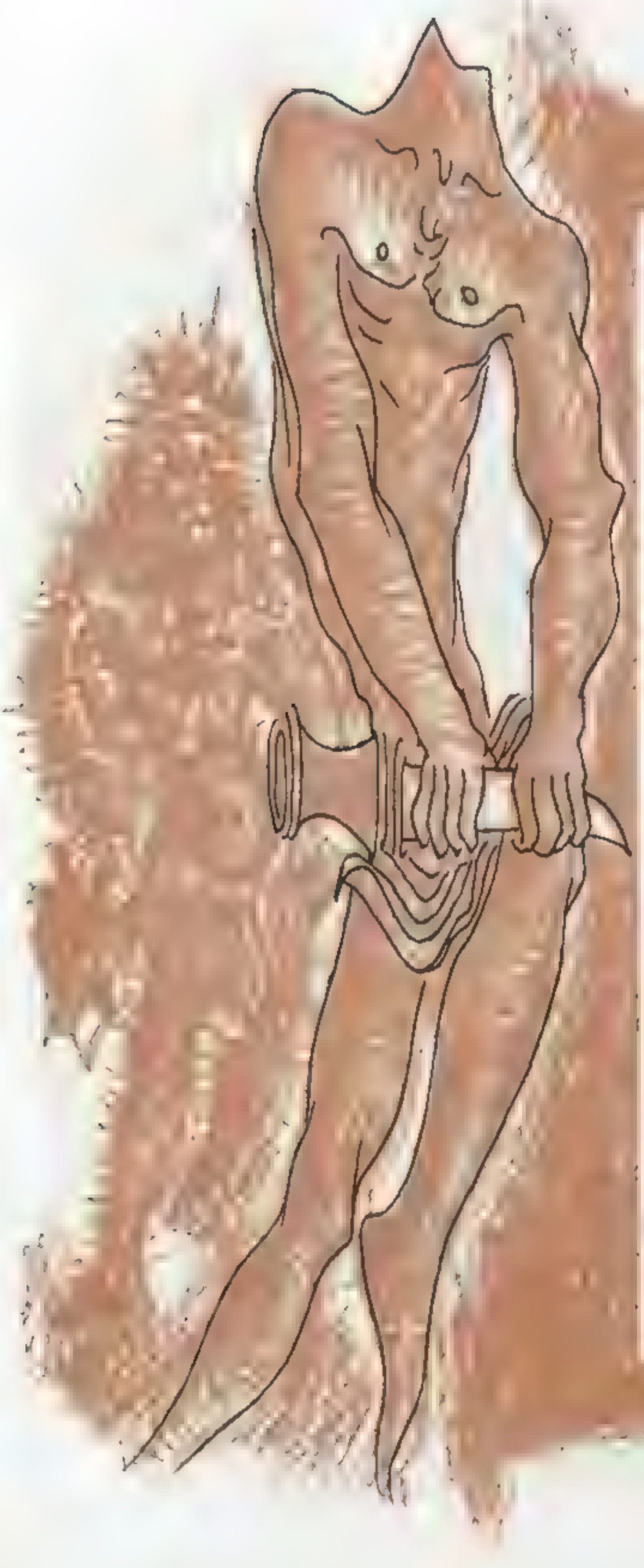

پھر اٹھا جو آستین اُلٹ کر خنجر
گردن سے مری رہ گیا کٹ کر خنجر
میرے تنِ بے سر نے "تڑپ کے" اُٹھ کر
جلّاد سے چھینا جو جھپٹ کر خنجر

مقتل میں ہوا وار تو میں تھا بے سر
میرے تنِ بے سر نے وہیں پر بڑھ کر
جلّاد سے چھینا تو وہیں ہاتھوں سے
گھٹنے پہ دباتے ہوئے توڑا خنجر

آنکھیں تھیں اُسے گھورتی جب مڑ دیکھا
میں توڑتا ہوں اُس کا ہی خنجر دیکھیں
سر کاٹ کے جلّاد نے میرے تن کو
مقتل میں بڑی دور سے جا کر دیکھیں

"ہم" ہی ابھی مقتل میں کھڑا تھا یارو!
اک وار میں پھر خون بہا تھا یارو!
سر میرا کٹ چکا تھا لیکن پھر بھی
"حق حق" لبوں سے نکل رہا تھا یارو!

جاناں سے محبت تو نہیں سر نے پہنچی
اس پردے میں کشفِ رازِ یعنی پہنچی
میں جتنی سمجھ رہا تھا کب وہ ایذا
ظالم نے فقط کھال ہی میری کھینچی

خوش ہونا جو جلادِ لعین آئے گا
رجبا ڈن تو حاکم کو یقین آئے گا
یعنی کہ یہ رازِ عشق لب تک میرے
وہ کھال بھی کھینچے تو نہیں آئے گا

کُپّی تری داشتہ نے بنوائی ہے
حاکم! تری خلوت میں وہ فن والی ہے
جو کھال مرے بدن سے تو نے کھینچی
فانوس کے تاروں پہ وہ تنوائی ہے

وہ بھید سے کرتا تھا بُرائی میری
تفصیل سے پھر خطا بتائی میری
جس جا کہ تھی داشتہ کی خاطر منظور
حاکم نے وہاں کھال بچھائی میری

ہم جھوم کے لہرا کے چلے مقتل میں
عشاق کے کشتے ہیں گلے مقتل میں
یہ حسن کا حق ہے جو ادا ہوتا ہے
جلاد کے خنجر کے تلے مقتل میں

گردن تو اڑا دے گی ہوائے خنجر
ہاں خون بہا دے گی ہوائے خنجر
لیکن جو چراغِ دل ہے روشن اس کو
کس طرح بجھا دے گی ہوائے خنجر

میں جب تھا لہولہان۔ بولا جلاد
پھر تیغ پہ رکھوں سان؟ بولا جلاد
مر کٹتے ہی، تا دیر میں تڑپا۔ مجھ سے
تو کتنا ہے سخت جان" بولا جلاد

جلاد کہ جب تان رہا تھا خنجر
کہتا تھا "قبول کر اطاعت بڑھ کر"
تو مار کے نعرۂ بغاوت دو چار
مقتل کو اٹھا لیا تھا میں نے سر پر

کل کی تری دھمکی سے فگار آیا ہوں
میں عشق میں سب کچھ ہی تو ہار آیا ہوں
گردن میں رسن ڈال کے اے حاکم!
خود دوش پہ لادے ہوئے دار آیا ہوں

جلادو! جلا دو تو نہیں کہنے کے
یا زندہ جلا دو تو نہیں کہنے کے
جو رازِ محبت ہے، اگر تم ہم کو
سولی پہ چڑھا دو تو نہیں کہنے کے

سجدے کے میں غالیچے پہ کیسے پڑھتا
سر جب سے کٹا پڑا تو لب سے کھولا
مقتل کی زمیں پر برسے لہو سے قالین
جب بن گئی اس پر پڑھا میں نے کلمہ

اپنی تو کہیں اور نظر ہی کب تھی
اس عشق میں ہاں راہِ مفر ہی کب تھی
گردن پہ چلا رہا تھا خنجر جلاد!
مقتل میں ہوں، یہ مجھ کو خبر ہی کب تھی

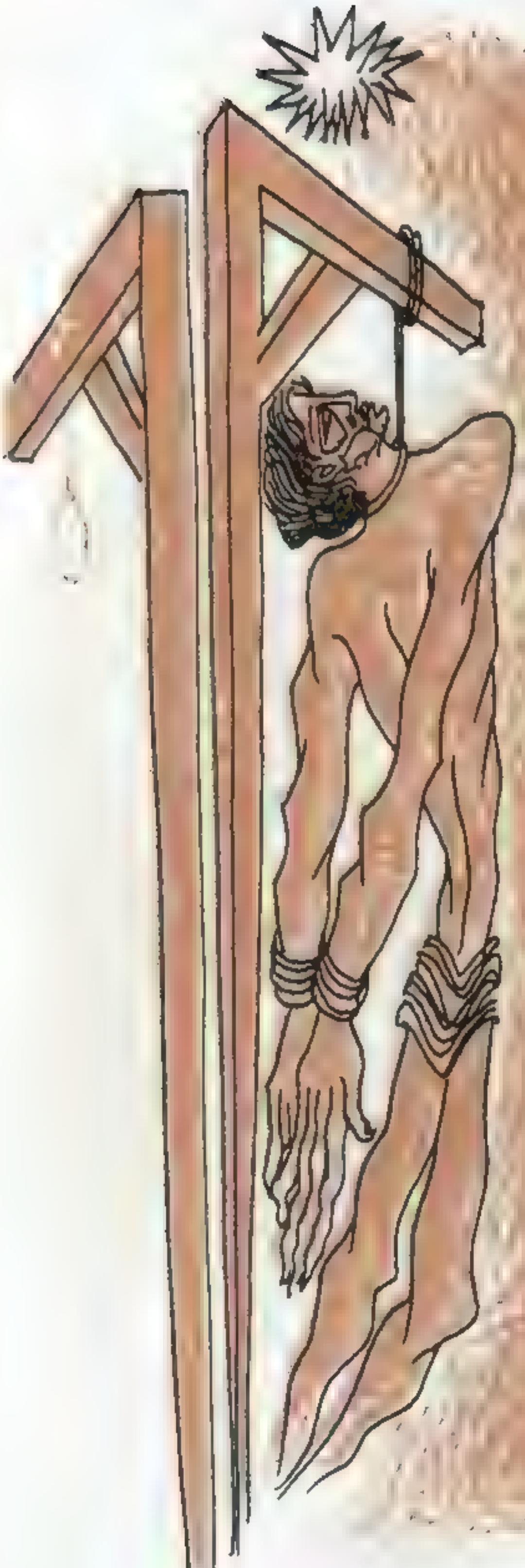

رد کر کے نوشت و خواند، دیکھا میں نے
ہر جبر تھی اُس سے ماند، دیکھا میں نے
کل دار پہ لایا جو گیا تھا مجھ کو
حلقے سے رسن کے چاند دیکھا میں نے

حلقے سے رسن کے نظر آیا۔ چوما
رہ رہ کے اُفق پر وہی مکھڑا، چوما
جب دار پہ آیا تھا تو میں نے پہلے
ریشم کا ٹنگا ہوا وہ پھندا چوما

کچھ بھی یہ شدائد کی گھڑی بات نہیں
زنجیر ہے کیا جبر، کڑی بات نہیں
اُس جانِ تمنا کا تصور کر کے
ہم جان جو دیدیں تو بڑی بات نہیں

ظالم ہیں لگائے ہوئے دُرّے شاید
پھر راز کو پوچھتے ہیں گھرے شاید
یاں جسم پہ بدھیاں سی اُبھریں میرے
واں دوست کے لگ رہے ہیں دُرّے شاید

اس جھول میں کس طرح سے جھولیں دیکھو
کچھ بھی ہو لب جاناں کو نہ بھولیں دیکھو
اب دار کی ۔ دار پہ لٹک کر یارو !
دم گھٹنے کے ہلا رہا ہوں جھولیں دیکھو

میں نیچے تھا تو ٹینک میں بولے اغیار
اب ہم بن کے اس کو خاک کر دیں اک بار
میں بن کے بھی بارود ہوا تھا اور پھر
شامل ہوا کہ اس میں مرے دل کا شرار

جو جسم میں ہڈیاں تھیں ڈھیلی کر دیں
گردن میں جو رسیاں تھیں ڈھیلی کر دیں
میں نے بھی کسی ٹینک کے نیچے لیٹ کر
اس ٹینک کی دھجیاں تھیں ڈھیلی کر دیں

بس لاہے بغاوت کی جو میں نے گھونٹی
ٹکراتا ہوں جس سے وہ ہے طاقت جھوٹی
میں ٹینک کے نیچے آ رہا ہوں تو کیا
اس آہنی بیل کے سینے ہوں چوٹی

یوں کب وہ نظر شکِ قمر آتا ہے
میں تم کو بتاتا ہوں کدھر آتا ہے
اُس شوخ کا جلوہ تو سرِ دار فقط
حلقے میں رسن ہی کے نظر آتا ہے

مژدہ ہے یہ مقتل سے بلاوا کیا ہے
آخر غمِ جاناں کا مداوا کیا ہے
اُس جانِ تمنا پہ نچھاور کرنے
اک جان ہے جان کے علاوہ کیا ہے

کھیتوں میں خرامِ نازِ ہل کا دیکھو
ویرانی کا چھٹ گیا دھندلکا دیکھو
جلاد سے خنجر کو جھپٹ کر ہل کا
خنجر کو بنا رہا ہوں پھل کا دیکھو

گو امن کے ہوں گیت میں گانے والا
گر وقت پڑے، سر ہوں کٹانے والا
میں چین کے دشمن سے اُسی کا ٹینک
ہوں اس کا ٹریکٹر بنانے والا

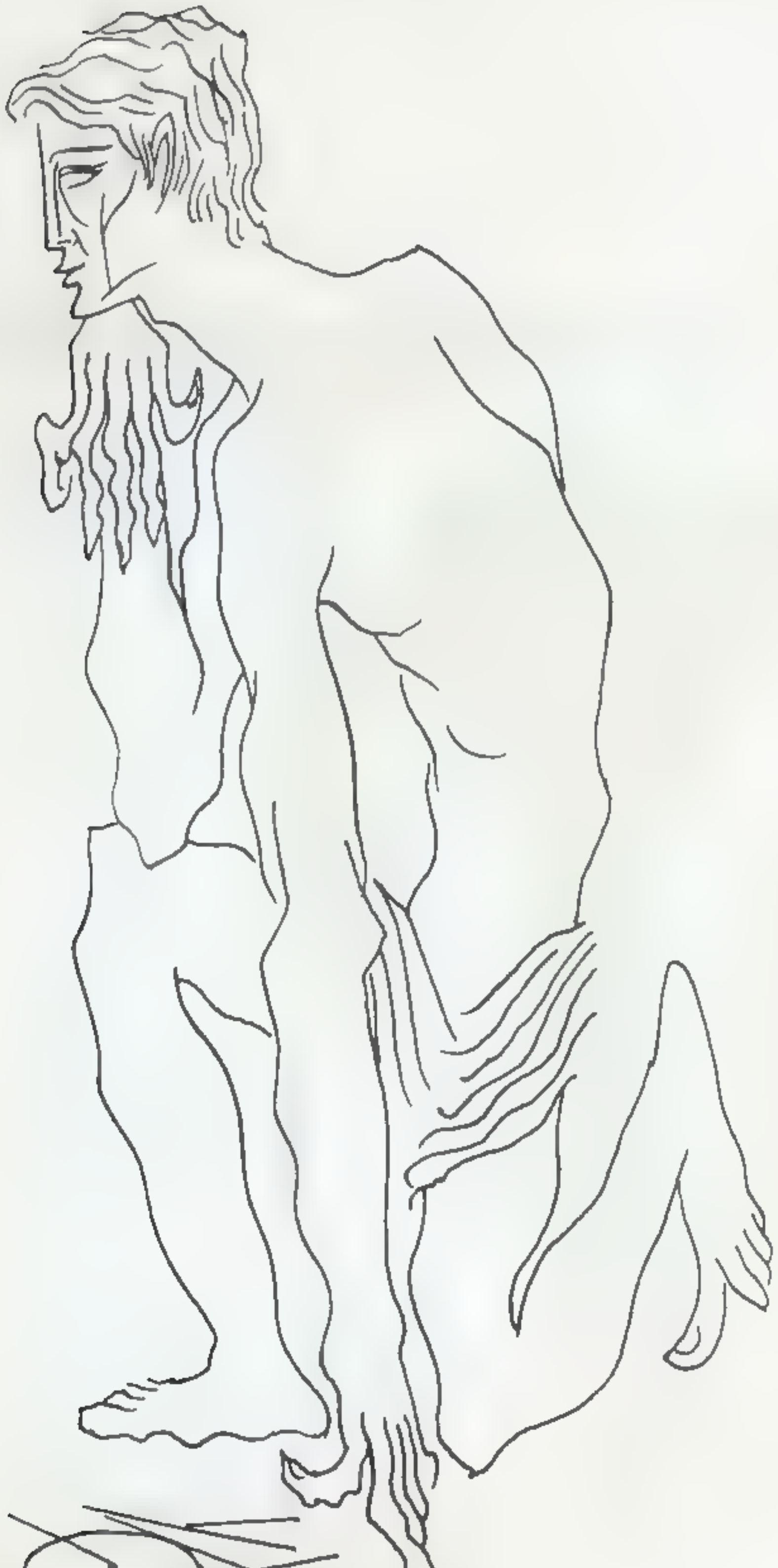

مُشاہدہ

مُحفل میں لئے ساز ہُو آنے والا
میں ننگا بہ صد ناز ہُو آنے والا
مجذوب کہو یا کہ قلندر مجھ کو
حق گوئی سے کب باز ہُو آنے والا

اپنے کو میں خود سلام کروں اِک بار
میں خود سے مزاج اپنا پوچھوں اِک بار
میں چاہتا یہ ہوں کہ کسی صورت سے
خود میں سے نکل کے خود کو دیکھوں اِک بار

ہستی کی قیود سے نکل کر بھاگوں
عالم کی حدود سے نکل کر بھاگوں
اِس فکر میں رہتا ہوں کہ آخر کیونکر!
میں اپنے وجود سے نکل کر بھاگوں

میں دل کے تقاضوں کو مروڑوں کیسے!
جو کچھ مری فطرت ہے وہ چھوڑوں کیسے!
زنجیرِ جبلت میں ہوں جکڑا ہوا میں
زنجیرِ جبلت کو میں توڑوں کیسے؟

خوں میرا بہا دے تو تعجب کیا ہے
اِک حشر اُٹھا دے تو تعجب کیا ہے
ہاں مجھ سے یہ میرا عشق اِک دن مجھ کو
سُولی پہ چڑھا دے تو تعجب کیا ہے

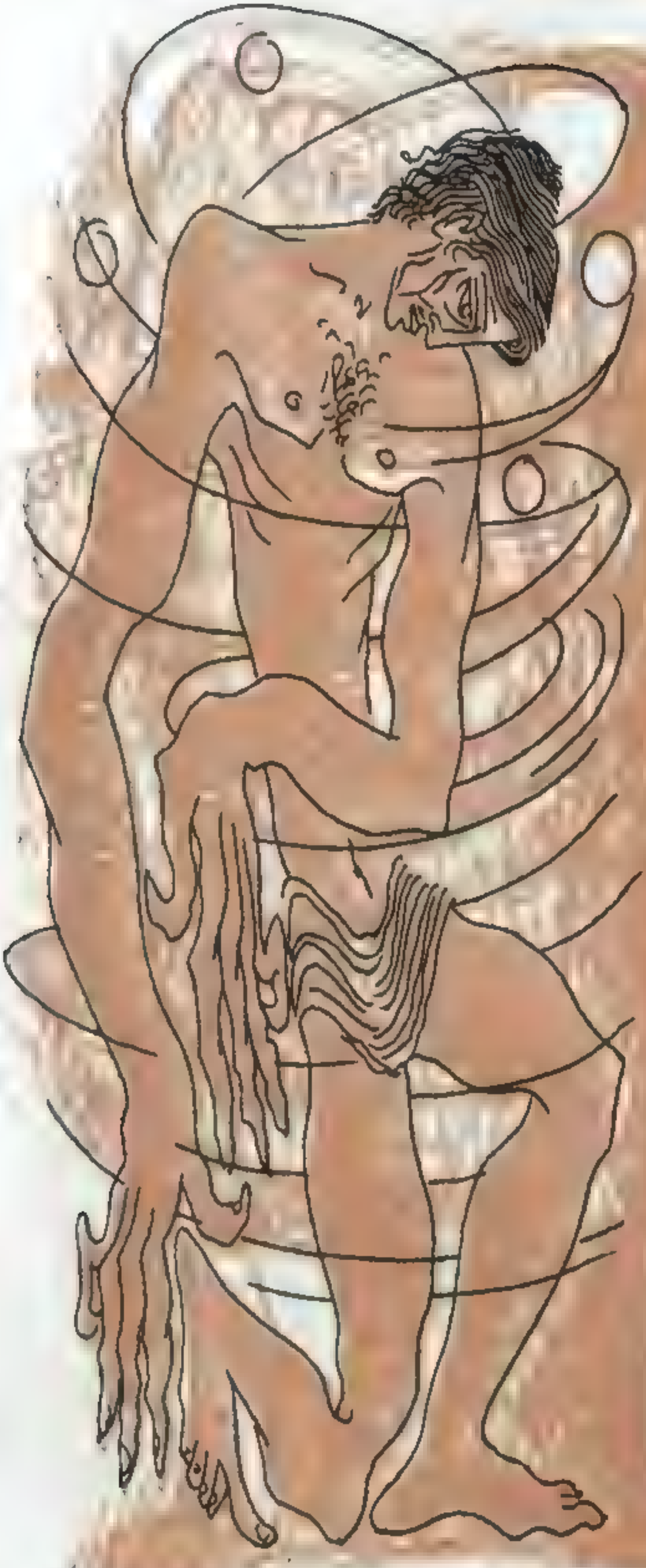

جو حرف کہ لکھا وہ دکھایا تم کو
جو خط کہ بنایا وہ دکھایا تم کو
برا جو ہے گرد و پیش، اُس کا عالم
جو میں نے ہے دیکھا وہ دکھایا تم کو

کب دہر سے کچھ بھی لیا ہے واپس میں نے
گر خود لیا تو کیا ہے واپس میں نے
جو کچھ مجھے دُنیا نے دیا تھا وہ سب
دنیا ہی کو کر دیا ہے واپس میں نے

تاریکی میں اک بات بتاتا ہوں تمھیں
سناٹے میں اک راگ سناتا ہوں تمھیں
وہ دُنیا کہ جس دُنیا میں، میں ہوں جیسے
میں نے اُسے دیکھا ہے، دکھاتا ہوں تمھیں

باطل کے جو ماحول میں کہتا حق ہوں
میں چاکِ گریباں ہوں تو سینہ شق ہوں
جاری ہیں وہ فلسفے کی بحثیں، لیکن
میں ہوں کہ تری یاد میں مستغرق ہوں

اک شاہ یہ بولا کہ محبت کی تھی
تری آنکھوں پہ اک شوخ کی صورت لی تھی
بس میں نے محبت میں حکومت ہی تو دی
سنتا ہوں کہ آدم نے تو جنت دی تھی

جاناں سے رفاقت کا نتیجہ دیکھا!
کچھ تو نے محبت کا نتیجہ دیکھا!
پھانسی کے ان احکام کے آئینے میں
حاکم سے رقابت کا نتیجہ دیکھا!

جو حسن کا جادو ہے جگا دیتی ہے
اتو جسے چاہے وہ بنا دیتی ہے
معمولی سی چھوکری جو دل میں ٹھانے
انگلی پہ ارسطو کو نچا دیتی ہے

انگلی پہ حکیموں کو نچانے والی
میدان میں شاہوں کو لڑانے والی
جو ایسی قیامت کی ہے، ہاں ہاں وہ بھی
کچھ دیر میں، دیکھنا، ہے آنے والی

شہزادی جو کالی کرنی جھٹ چمن نکلی
شہنوں میں رقابت ہوئی، ان بن نکلی
آج اس کی ہی کھوپڑی میں انڈے دے کر
اک آنکھ کے دائرے سے ناگن نکلی
ڈھے بکھرے پڑے ہیں دیکھو تو کھنڈر
جس کھوپڑی پہ بیٹھا ہے کوا آ کر
اس کا بھی صدا آتی ہے کیا تھا اک دن
قاروں نے خزانے کو بکھارا جس پر
آہٹ سی ہوئی کھوپڑی میں جو سے جاگے
کیا دیکھتے ہم آج کھنڈر سے بھاگے
فرعون بھی جھک رہا تھا جس کے آگے
رخ پہ طمانچہ دیکھا
شہزادے سے لڑائی ہوئی جس کے باعث
کھنڈر میں ڈھانچہ دیکھا

اے شوخ! یہ دُنیا ہے شعوری دُنیا
گر میں نہیں تیری ہے اَدھوری دُنیا
تو میری ہے دنیا کا فقط اک حصّہ
اور میں تری پوری کی ہوں پوری دُنیا

اے جان! تری ہر بات میں، میں ہی میں ہوں
یعنی ترے دن رات میں، میں ہی میں ہوں
ہے میرے خیالات میں جانے کیا کیا
اور تیرے خیالات میں میں ہی میں ہوں

کہنے ترے اِس دل نے ہیں مانے کیا کیا
گائے ہیں ترے واسطے گانے کیا کیا
اے شوخ! خیالات میں میرے، لیکن
ہے تیرے علاوہ بھی نہ جانے کیا کیا

میں سوچتا ہوں رات میں جانے کیا کیا
پنہاں ہے ہر اک بات میں جانے کیا کیا
تُو تو یہ سمجھتی ہے کہ تو ہی تو ہے
ہے میرے خیالات میں جانے کیا کیا

چلتا ہوا یہ سانس دیا ہے کس نے؟
کیچڑ میں ہمیں دھانس دیا ہے کس نے؟
اک چارہ و مادہ کا ہے چکر جس میں
اِس طرح ہمیں پھانس دیا ہے کس نے؟

تھی اُن کی جو دل پسند خوشبوئے مادہ
چارہ کھا کر چلا وہ سوئے مادہ
اک فیل ہے اُس سمت روانہ، دیکھو
جس سمت سے آ رہی ہے بوئے مادہ

لکھتے تھے محبت کے وہ خط، سلسلہ تھا
بالکل تھا بجا، کب وہ غلط سلسلہ تھا؟
لیلیٰ مجنوں کا عشق، میرے نزدیک
ہاں اک نر و مادہ کا فقط سلسلہ تھا

بو سونگھ کے ایک سُو میں نکلا دیکھو
اک عالمِ ہاؤ ہو میں نکلا دیکھو
چارے کی تلاش سے نمٹ کر اک فیل
مادہ کی ہے جستجو میں نکلا دیکھو

ہم دونوں ہیں عطر بیز، جانِ شیریں!
آہستہ، کبھی ہیں تیز، جانِ شیریں!
یہ ردّ و بدل ساخت میں ہم دونوں کی
کس حد کی ہے معنی خیز، جانِ شیریں!

آئینے میں یہ ترا سنورنا کیا ہے!
ہر تیری ادا پر مرا مرنا کیا ہے؟
آپس میں ہماری یہ محبت اے جان!
اک ساخت کا ہے فرق، ہو گر، کیا ہے!

جانی! یہ جو دل چاہیں فریادی ہے
اس سے ہی دل و روح کی آبادی ہے
یہ ہی تو ہے اک وجہِ محبت، اپنے
اجسام میں اک فرق جو بنیادی ہے

یہ کون سے شعلوں کی تپش ہے اے شوخ!
کیوں اپنے دلوں میں یہ خلش ہے اے شوخ!
ہاں جسم میں میرے اور بدن میں تیرے
اک فرق جو ہے وجہِ کشش ہے اے شوخ!

اِک بات کہ تجھ سے مری ہر رات بنی
کتنی یہ حسین صورتِ حالات بنی
مجھ میں ہی سے ہو کے تجھ میں اک شے تفریق
اِک حسن و محبت کی مساوات بنی

کہتی ہے ہر اک روئے صنفی کی صورت
اعدادِ جلی اور خفی کی صورت
ہے حسن و محبت کی ریاضی کا سوال
جسموں میں یہ اثبات و نفی کی صورت

اے شوخ! ہے کب نفاق، مجھ میں تجھ میں
اِک وصل ہے اِک فراق، مجھ میں تجھ میں
اجسام میں اختلاف، میرے تیرے
ہے وہ ہی تو اتفاق، مجھ میں تجھ میں

آسودگیٔ جاں کی روش ہے اور بس
جذبات کے شعلوں کی تپش ہے اور بس
دیوانگیٔ قیس برائے لیلیٰ!
مادہ کی طرف نر کی کشش ہے اور بس

نوائی قریب ہے، جو دیکھا جائے
ہستی کی نقیب ہے، جو دیکھا جائے
اور زندہ تناقضوں کی نفی کر کے یہ تن
بالکل ہی عجیب ہے، جو دیکھا جائے

اے شوخ! جبلت سے ہم بھلے لگتے ہیں
اور حسن کے سانچے میں ڈھلے لگتے ہیں
کتنے ہیں عجب جسم ہمارے، اور ہم
ہوتے ہیں بغل گیر، گلے لگتے ہیں

جو چیز ہے مجھ میں، تجھ میں کب ہے اے شوخ!
جو مجھ میں نہیں تجھ میں وہ سب ہے اے شوخ!
ہم دونوں کو یوں ایک کیا ہے جس نے
وہ صورتِ حالات عجب ہے اے شوخ!

خلعت میں ہیں مل کے ایک جانِ شیریں!
ہم پھول ہیں کھل کے ایک جانِ شیریں!
اجسام میں اثبات و نفی کے باعث
ہم دونوں ہیں مل کے ایک جانِ شیریں!

یہ صورتِ ہست و بود، ہے ہی کیا شے
یہ قامتِ صد قیود، ہے ہی کیا شے
اک میری نظر کا زاویہ ہے، ورنہ
اے شوخ! ترا وجود، ہے ہی کیا شے

اے شوخ! ترے حسن کا افسوں کیا ہے!
یہ جسم ترا، سوچ رہا ہوں، کیا ہے!
یہ میری نگاہوں کے ہی پیچ و خم ہیں
تو کیا ہے! ترا قامتِ موزوں کیا ہے!

سرشار تھی بوستاں میں شاخِ مستی
سرسبز تھی گلستاں میں شاخِ مستی
گو خواب میں نخلِ جاں تھا شب کو، لیکن
بیدار تھی نخلِ جاں میں شاخِ مستی

ہاں گرچہ خلیج میں اُٹھے تھے طوفاں
پورے نہیں ہو پائے صدف کے ارماں
صحراؤں کی وسعت پہ گزشتہ شب میں
برسا تھا مگر زور سے ابرِ نیساں

کہتا ہوں، ہے جو کچھ کہ حقیقت میری
اے شوخ! بھلا کیا ہے محبّت میری
جتنی مجھے تیری ہے ضرورت، بالکل
اتنی ہی تجھے خود ہے ضرورت میری

اے شوخ! محبّت ہے ضرورت کیلئے
تیری ہے ضرورت مری خلوت کیلئے
اپنی راحت سے تیری راحت مجھ کو
بڑھ کر ہے، فقط اپنی ہی راحت کیلئے

اے شوخ! ترے ہجر میں آہیں بھرنا
خود اپنے ہی آپ پر ہے گویا مرنا
اگر یہ تو فقط ساخت کی مجبوری ہے
خود کو میں کلیجے سے لگا لوں ورنہ

کس دھوکے میں ہے، مجھ سے ہے جو مجھ کو پیار
ہے ساخت کی حد بندی بظاہر ہے نگار
خود اپنے ہی رخسار کو چوموں کیونکر؟
اس واسطے چومتا ہوں تیرے رخسار

بڑھتا ہوں کبھی، کبھی ہوں گھٹتا اے شوخ
کب راہِ محبت میں ہوں ہٹتا اے شوخ!
تو تو یہ سمجھتی ہے کہ تجھ سے، دراصل
ہوں اپنے ہی آپ سے لپٹتا اے شوخ!

شعلوں کی ندی کو پار کرنے والا
گو تجھ پہ ہوں جان نثار کرنے والا
اے شوخ! ترے لب پہ بہت ہی کس کر
میں خود کو ہوں خود پیار کرنے والا

عشق اور مجھے، تجھ سے؟ نگارِ گلفام!
خود اپنا میں عاشق ہوں، نہیں اس میں کلام
ترے لب و رخسار پہ، تو کیا جانے
میں اپنے ہی لے رہا تھا بوسے، کل شام

اِک عشق کا پیمان کب تھا تجھ سے
"تو تو ہے مری جان" کہا تھا تجھ سے
خود کو تھا کلیجے سے لگایا میں نے
ظاہر میں بغل گیر ہوا تھا تجھ سے

دونوں کو یونہی کہے ہے کہانی دشمن
اِک شوخ کی کرتی تھی جوانی دشمن
جسموں میں مماثلت تھی جس کے باعث
قابیل تھا ہابیل کا جانی دشمن

ہم جنس سے اِس حد کی رقابت کیوں تھی
اور جنسِ مخالف پہ طبیعت کیوں تھی
قابیل نے ہابیل کو مارا کیوں تھا!
اور آدم و حوا میں محبت کیوں تھی

تھا پیرہنِ حسن و محبت سِلنا
تھا شاخ پہ دراصل کلی کا کھلنا
حوا کے جمالِ مختلف سے بڑھ کر
آدم کے وجودِ مختلف کا مِلنا

اے شوخ! نہیں گل، کھینچ رہی ہے مجھ کو
قیمت سے ادا، کھینچ رہی ہے مجھ کو
جو مجھ میں نہیں ہیں ایسی چیزیں تجھ میں
ہاں تیری طرف کھینچ رہی ہیں مجھ کو

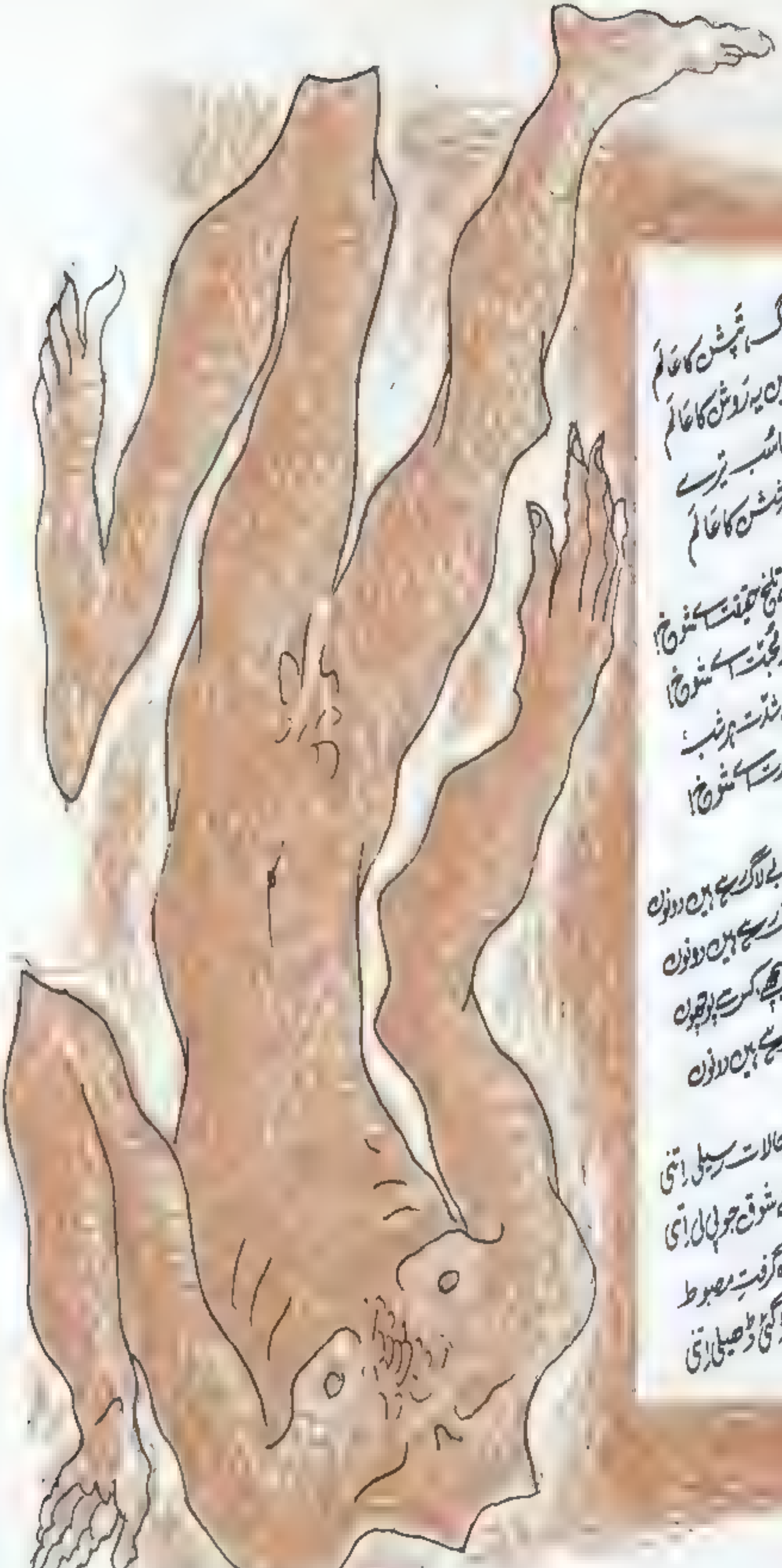

جذبات کی یہ آگ، تپش کا عالم
اے شوخ! چمن میں یہ روش کا عالم
اعضاء کا بلاخیز تناسب تیرے
اُفوہ! تری جنسی کشش کا عالم

کہدوں؟ وہ جو ہے تلخ حقیقت اے شوخ!
تو جانتی ہے اُس کو محبت اے شوخ!
اس جسم کو پیرے جو بہ شدت ہر شب
ہے تیرے بدن کی جو ضرورت اے شوخ!

سب لاگ ہیں، بے لاگ رہے ہیں دونوں
اک ساتھ ہی ہم جاگ رہے ہیں دونوں
کون آگے ہے، کون پیچھے، کس سے پوچھوں
ہم دائرے میں بھاگ رہے ہیں دونوں

تھی صورتِ حالات رسیلی اتنی
اے شوخ! مئے شوق جو پی لی اتنی
آپس میں ہماری وہ گرفتِ مضبوط
اک آن میں کیوں پڑ گئی ڈھیلی اتنی

اے شوخ! بہت تر نکل کر بھی
مجھ میں سے بہ شدت وہ اُبل کر بھی
وہ ایک شرارہ بھی عجب تھا تجھ تک
جو تارِ محبت پہ تھا چل کر بھی
اے شوخ! قیامت کی نشانی تو ہے
جاری رہے جو، ایسی کہانی تو ہے
میں تیرے ہی گرداب میں بجھ جاؤں گا
میں جو ہوں اگر آگ تو پانی تو ہے
خود آگ تھا جل رہا تھا میرا جوہر
لاوا تھا، اُبل رہا تھا میرا جوہر
جتنا اُسے روکنا تھا چاہا میں نے
اتنا ہی نکل رہا تھا میرا جوہر
ہم دونوں کے اِن ٹوٹے دِلوں سے جُڑ کر
اے شوخ! بہار آئی جو دیکھا مُڑ کر
جگنو کسی شاخ پہ چمکا اور پھر
سینے پہ ترے چمن کے بیٹھا اُڑ کر

نوا رنگ اک جہان کو دیکھا ہوتا
تخلیق کے کاروان کو دیکھا ہوتا
جب بیٹھے ہیں اپنی ماں کے پیٹ میں بچے
اے کاش کہ اپنی ماں کو دیکھا ہوتا

ہے نشو و نما سے خاص اس کی اعجاز
اس شوخ کے سب ناز ہیں بچی کے ناز
اب اس میں حرارت کے نہیں ہیں تیور
اب اس میں متانت کا نیا ہے انداز

ہیں اس کے خد و خال چمکتے دیکھو
اک نور ہے سب پہلو دمکتے دیکھو
اس کے جسے کچھ روز میں ماں بننا ہے
اک جسم میں دو جان ہیں دھڑکتے دیکھو

اُمید سے وہ شوخ ہے گر جائزہ ہیں
ہم جاہ و جلالِ شاہ و دردا دیکھیں
اور تاج ہمو دا رستم پر رکھ کر
پہلے ہی ماں سے اُس کی تاجپوشی کروں

جمع - ملک آبیانی

کس ناز سے نازوں کی پلی آئی ہے
بن کر وہ یہاں نقش جلی آئی ہے
شاید کوئی تصویر ہے زندہ ہو کر
غاروں سے اجنٹا کے چلی آئی ہے

اِنساں کی ہر حد کو نہ چھُو پاتا تھا
پھر حد سے سوا حسُن نمُو پاتا تھا
غاروں میں اجنتا کے مِری تصویروں میں
تجھ سے نہ ملا تھا تو غلو پاتا تھا

شک گزرا ہے، دیکھا جو تری صورت کو
لنکا کی طرف سے جو چلے مُورت کو
بھگوان نے چھوڑا تھا، زندہ کرنے
شاید کہ ایلورا میں کیسی مُورت کو

اِک پل ہی میں تو بن گئی، جانِ گلفام
دیوار سے نکلی تو ہوئی مستِ خرام
تصویر میں رانی کی۔ اجنتا جا کر
اِک روح جو بھگوان نے پھونکی کل شام

تو ہے کہ ایلورا کی کوئی مورتی ہے
اتنی جو بدن کی ترے خوبصورتی ہے
اعضائے نمودار کی گولائی سے
رہ رہ کے تری جنسی کشش پھوٹتی ہے

یہ جسم ہے ترا کہ قیامت ہے چندا!
مت پوچھ کہ کیا سوچ رہا ہے بندہ؟
ہے جو ترے پیکر میں کشش کا چکر
اک پست و بلند کا ہے گورکھ دھندا!

ہاں ہاں! یہ شریر ہے بہت ہی پوشاک
اے شوخ! بڑی شوخ ہے تری پوشاک
بھرپور بدن پر ترے چسپاں ہو کر
کھاتی ہے خطوطِ تن کی چغلی پوشاک

ظاہر ہے وہ ہر جا جو ہے اندر اے شوخ!
ہے ترا بدن مست قلندر اے شوخ!
پوشاک کے ساحل میں سمائے کیونکر!
یہ تری جوانی کا سمندر اے شوخ!

چل کر یہاں آنے کا قرینہ ترا!
کیا عطر و گلاب ہے؟ حسینہ ترا!
میرے لئے قاتل ہے، تلوے پہ ترے
بغلوں سے جو رستا ہے پسینہ ترا!

بالکل ہی خفی، ہم کو کلی لگتی ہے
بن جاتی ہے جب پھول بھلی لگتی ہے
جس عمر سے آتی ہے جوانی، اُس سے
ہو جاتی ہے ڈھلتی تو بھلی لگتی ہے
دیتی ہے مزہ جب ہو کہانی آدھی
پوشاک ہو اُودی اور دھانی آدھی
صورت میں حسینوں کی ہیں معنی آتے
جب اُن کی گزر جائے جوانی آدھی
پھر اُس میں اِک آغازِ کمال ہوتا ہے
صورت سے معانی کا وصال ہوتا ہے
معراجِ شباب پر پہنچ کر جب حُسن
جس دن سے کہ مائل بہ زوال ہوتا ہے
جو حرف شراب میں نہیں ہے آتا
وہ اپنی کتاب میں نہیں ہے آتا
مکھڑے پہ کسی شوخ کے کچا پن ہو
تو اپنے حساب میں نہیں ہے آتا

کہتے ہیں: ہو صادقین کیسے؟ اب تک
کچھ خوردی بزرگی نہیں جیسے اب تک
کیوں مجھ سے یہ نوخیز حسین بولتے ہیں؛
جیسے کہ برابر کا ہوں ایسے اب تک

ہاں ہوتے ہیں حشر خیز کتنے چہرے
ساغر ہیں ہیں جلوہ ریز کتنے چہرے
نوخیز و شگفتہ رُخ ہیں آبِ شفاف
ہیں مجھ کو شرابِ تیز کتنے چہرے

اُس نے جو تعارُف ہوا کیسے دیکھا
مجھ کو، میں بتاتا ہوں کہ جیسے دیکھا
اِک آن، سرِ بزم ملا کر آنکھیں
جیسے کہ وہ شیرنی ہو ایسے دیکھا

میں سادگیٔ حُسن پہ کب ہوں مائل؛
پُرکاری کا پردہ نہ ہو جب تک حائل
اِک شیرنی کی جب سے کہ آنکھیں دیکھیں
میں چشمِ غزالاں کا نہیں ہوں قائل

چلنے میں تھی تیر چڑھے، مجھ کو دیکھا
پھر تیر پہ تیر چھوڑے، مجھ کو دیکھا
کل بزم میں نیم رُخ بھی رہ کر اُس نے
گردن کو بغیر موڑے، مجھ کو دیکھا

گھونگٹ کو بڑھائے گی، نہ دیکھا میں نے
نظروں کو جھکائے گی، نہ دیکھا میں نے
اُس شوخ کو محفل میں، اِس اندیشے میں
زہ آنکھ چرائے گی، نہ دیکھا میں نے

وہ تیکھے خد و خال نکھارے دل میں
وہ گیسوئے خم دار سنوارے دل میں
نظروں میں ہیں کس کس کے کتابی چہرے
کس کس کے ہیں نیم رُخ ہمارے دل میں

ہاں دل کے گداز کی بدولت دل پر
کتنا ہے جلی نقشِ حقیقت دل پر
یہ نا کہ یہ نقش ہے نہ جانے کس کا!
اک سایۂ نیم رُخ کی صورت دل پر

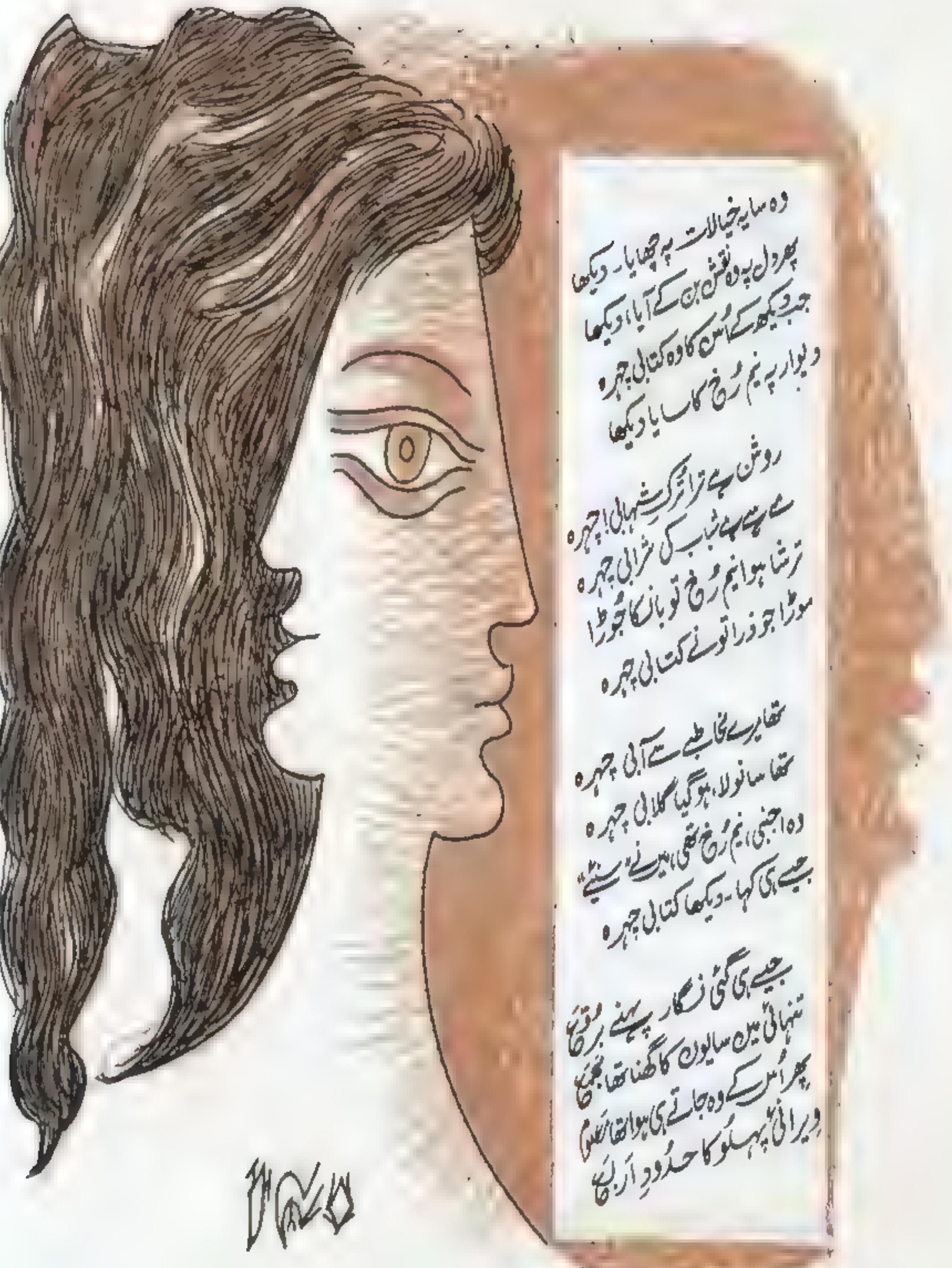
وہ سایہ خیالات پہ چھایا۔ دیکھا
پھر دل پہ وہ نقش بن کے آیا، دیکھا
جب دیکھ کے اُس کا وہ کتابی چہرہ
دیوار پہ نیم رُخ کا سایا دیکھا

روشن ہے ترا ترکِ شہابی! چہرہ
سے بہتی ہے شباب کی شرابی چہرہ
ترشا ہوا نیم رُخ تو بانکا جوڑا
موڑا جو ذرا تو نے کتابی چہرہ

تھا میرے تخاطبے سے آبی چہرہ
تھا سانولا، ہو گیا گلابی چہرہ
وہ اجنبی، نیم رُخ تھی، میں نے "سنیے"
جیسے ہی کہا۔ دیکھا کتابی چہرہ

جیسے ہی گئی نگار پہنے برقع
تنہائی میں سایوں کا گھنا تھا مجمع
پھر اُس کے وہ جاتے ہی ہوا تھا معلوم
ویرانیٔ پہلو کا حدودِ اربع

اے شوخ! ان چھٹ رہے ہیں بادل دیکھو
آکاش سے چھٹ رہے ہیں بادل دیکھو
پردوں کو تکلف کے اُٹھایا جائے
تمہارے چھٹ رہے ہیں بادل دیکھو

بھرپور شباب ہے، وہ زنکلا ٹکڑا
کتنی تب و تاب ہے، وہ زنکلا ٹکڑا
جزدان سے جیسے کہ صحیفہ نکلے
کچھ ایسے نقاب سے، وہ زنکلا ٹکڑا

گورے بھی تو یہ گال نہیں ہیں میرے
گھونگر کے بھی تو بال نہیں ہیں میرے
سُننے کو بہت خوب ہیں مجھ سے بولی:
"کچھ خاص خد و خال نہیں ہیں میرے"

دل خوش ہے، ہم عشق کے مرکز دیکھا
آگے ترے ان رنگ اُڑ دھوکوں کا
اس سانولے مکھڑے میں جیسے شامل
ہلکا سا ہے کچھ رنگ بھی اگلے دن کا

ہم فرض کریں قلب و نظر اک بات کریں
جو اُن کی ہو مرضی کی وہ ہر بات کریں
ہم پوری طرح گوش بر آواز رہیں
علامہ حسینوں کی اگر بات کریں

علامہ دکھاتے ہیں فلک کے اسرار
ہیں میرے تصور میں وہ زلف و رخسار
مابعد طبیعات کے لاکھوں نکتے
اُس گال پہ چھوٹے سے مُہاسے پہ نثار

اِس عمر کی کرتا ہے نمائندگی تِل ہے
میں سمجھا کہ یہ کوئی خرابی تِل ہے
یہ گال پہ چھوٹا سا مُہاسا، تیرے
میری تو نظر میں اک گلابی تِل ہے

مشاطہ کا دم روئے حسیں پر نکلا
فطرت کا کرم اس کے جبیں پر نکلا
اُس شوخ کے ماتھے پہ مُہاسا چھوٹا
بندیا جہاں لگتی ہے وہیں پر نکلا

علامہ سے ملنے کے لیے جاتا تھا
دل نور سے پُر اپنا کیے جاتا تھا
اور راہ میں اک جاننے والی جو ملی
گھر لے گئی اپنے تو پیے جاتا تھا

پیمانۂ گل تر سے چھوا تھا میں نے
گیسوئے معطر سے چھوا تھا میں نے
کل باتوں ہی باتوں میں چرا کر اُس کے
ہونٹوں کو بھی ساغر سے چھوا تھا میں نے

دل میرا بہر کیف وہ رکھ لیتی ہے
اشیاء کی حقیقت کو پرکھ لیتی ہے
دیتی ہے مجھے جام تو اُس سے پہلے
تھوڑی سی کنارے پر وہ چکھ لیتی ہے

اک جام شراب کی کسر تھی باقی
اک بندِ نقاب کی کسر تھی باقی
وہ حسن کا عالم بھی عجب تھا جس دم
ہلکے سے حجاب کی کسر تھی باقی

اُس شام وہ ترمیں دردِ تنہا اُس کا
میں پاس ہوا تو دُور رہنا اُس کا
مجھ سے، ذرا شرما کے، "طبیعت میری
کچھ آج ہے ناساز" یہ کہنا اُس کا

تھا حُسن کا اُس کے ساز، بدلا بدلا
تھا دیدۂ نیم باز، بدلا بدلا
اُس شوخ کا ہاں آج نہ جانے کیوں تھا،
اندازِ خرام ناز، بدلا بدلا

اِک رابطہ قائم جو رہے ہم سے اب تک
وابستہ ہیں زُلفوں ہی کے خم سے اب تک
جتنا بھی رہے یہ ذہنی توازن اپنا
قائم ہے حسینوں کے کرم سے اب تک

جیسے خَسم کا گُل میں صبا شامل ہے
ایسے ہی دعاؤں میں شِفا شامل ہے
کیوں حال ہمارا نہ ہو اچھا سب سے!
جب اِس میں حسینوں کی دُعا شامل ہے

کب تارِ نفَس کس رہی ہے میرے دل کو
پیچوں میں وہ کس رہی ہے میرے دل کو
ناگن سی ہے پیکر کی لچک میں تیرے
پھنکار سے ڈس رہی ہے میرے دل کو

اے شوخ! میں مجبور ہوں آ جاتا ہوں
پھل گرتا زمیں پر ہے یہ سمجھاتا ہوں
ہاں تیری طرف جنسی کشش کے باعث
میں کیا کروں، کھنچتا ہی چلا آتا ہوں

گہری ہے، یہ جو دل میں خلش ہے اے شوخ
اک شعلہ ہے، جدت ہے، تپش ہے اے شوخ!
جیسے کہ پٹاری میں ہو ناگن، ایسے
پیکر میں ترے جنسی کشش ہے اے شوخ!

ہوں راز تو راز کے علاوہ کیا ہوں؟
اک عارفِ ساز کے علاوہ کیا ہوں؟
میں، تو جو اگر حسن کی سارنگی ہے
سارنگی نواز کے علاوہ کیا ہوں؟

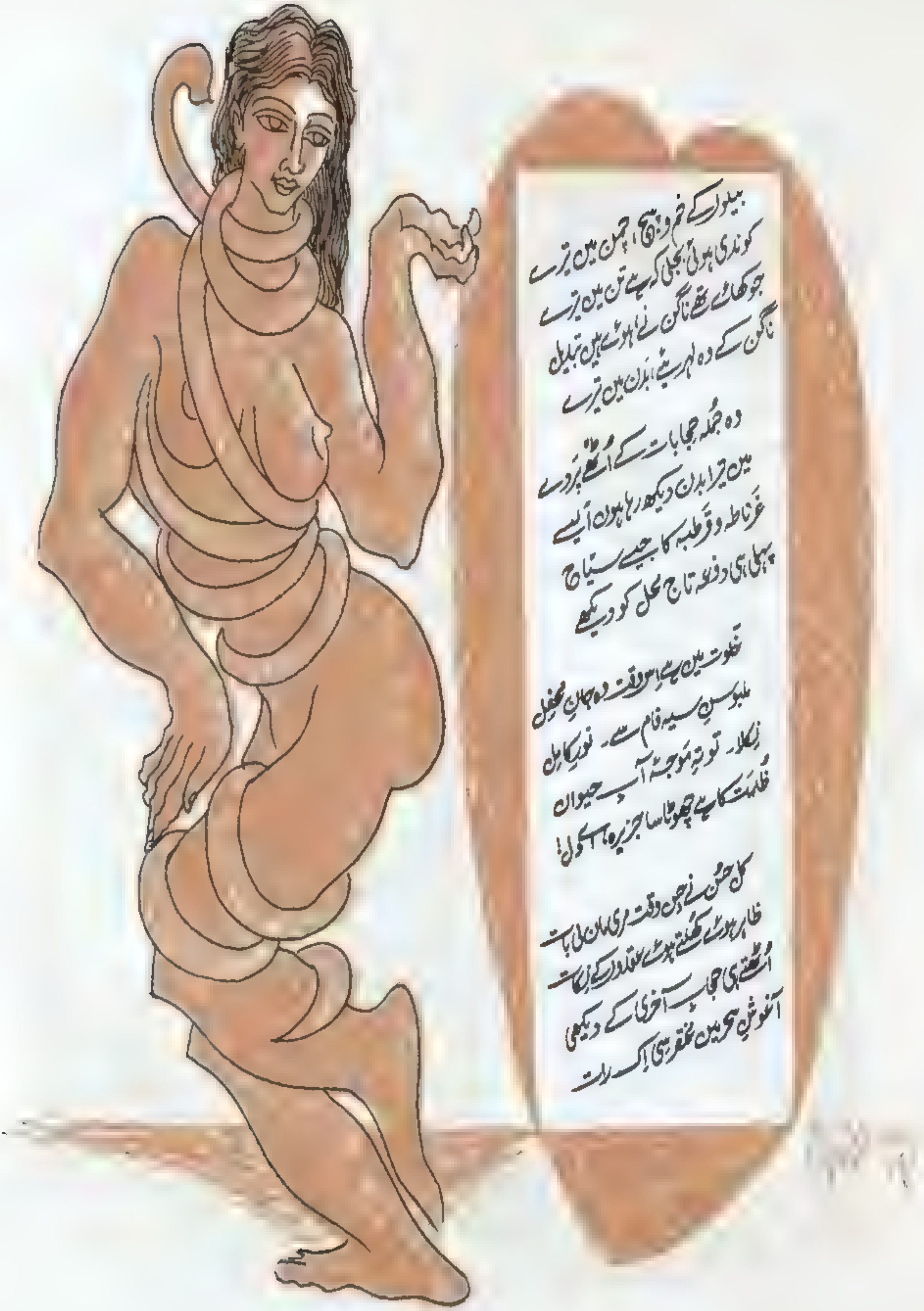
بیلور کے خم و پیچ، چمن میں ترے
کوندی ہوئی بجلی کی ہے تن میں ترے
جو کھائے تھے ناگن نے، ہوئے ہیں تبدیل
ناگن کے وہ لہریئے، بدن میں ترے
وہ جملہ حجابات کے اُٹھے پردے
میں تیرا بدن دیکھ رہا ہوں ایسے
غرناطہ و قرطبہ کا جیسے سیاح
پہلی ہی دفعہ تاج محل کو دیکھے
خلوت میں ہے اس وقت وہ جانِ تخیل
ملبوسِ سیہ فام سے۔ نور کا پل
نکلا۔ تو ہے یہ موجۂ آبِ حیوان
ظلمت کا ہے چھوٹا سا جزیرہ ہیکول!
کل حسن نے جس وقت مری مان لی بات
ظاہر ہوئے کھلتے ہوئے عقدوں کے نکات
اُٹھتے ہی حجابِ آخری کے دیکھی
آغوشِ سحر میں مختصر سی اک رات

خلوت ہی میں سازِ حسن ہوگا اور میں
اک نغمۂ رازِ حسن ہوگا اور میں
یہ بندِ غرورِ حسن، جس دم ٹوٹا
سیلابِ نیازِ حسن ہوگا اور میں

اے کاش کہ وہ گھڑی بھی دیکھیں اک شب
ہم حسن کی روشنی بھی دیکھیں اک شب
تیور وہ غرور کا تو دیکھا اک روز
اندازِ سپردگی بھی دیکھیں اک شب

خلوت ترے دم سے ہے خزانہ اے شوخ!
تو کیا ہے؟ حقیقت کہ فسانہ اے شوخ!
گلدستے پہ لپٹا ہوا ملگسی کاغذ
ہلکا سا یہ ملبوسِ شبانہ، اے شوخ!

لپٹی ہوئی ہر شکن میں قیامت کیا تھی!
آنکھیں تھیں چکا چوند، وہ صورت کیا تھی!
چادر کو جو پیکر سے گرایا اس نے
اک بقعۂ انوار تھی، خلوت کیا تھی!

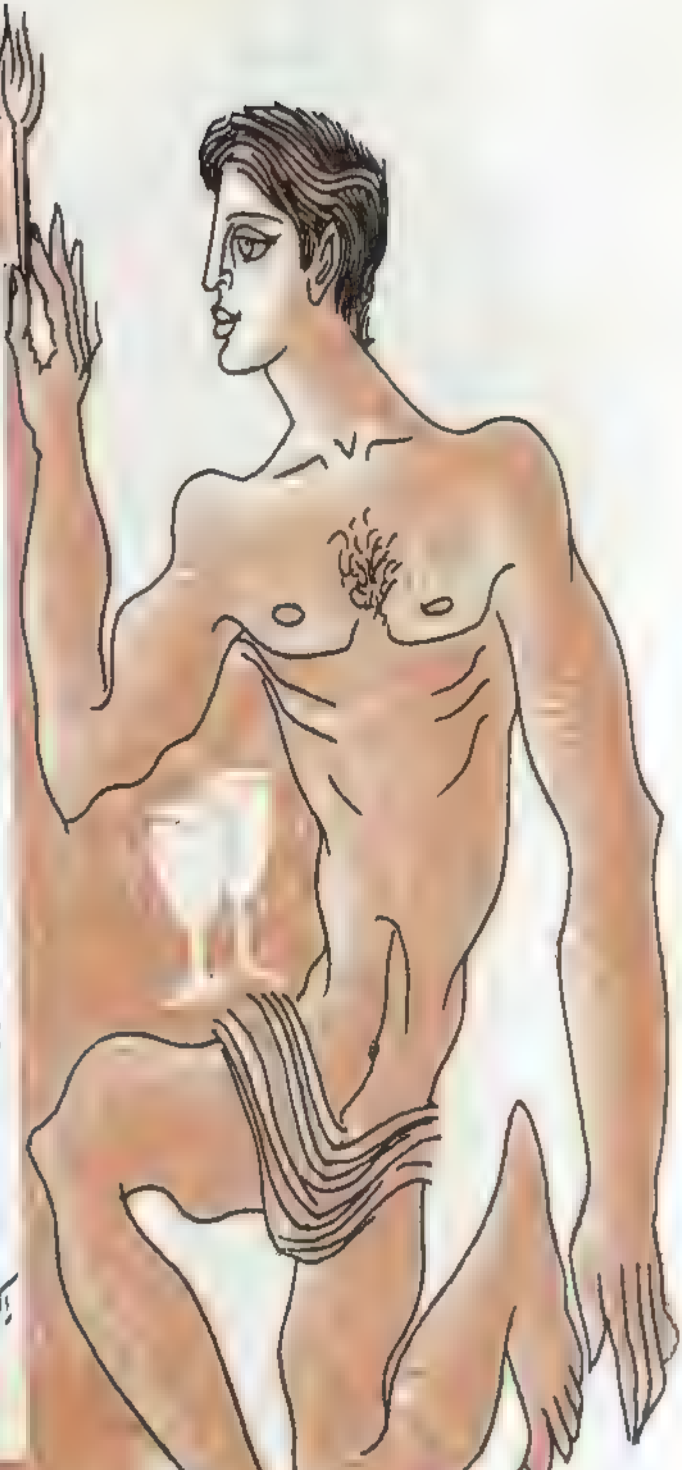

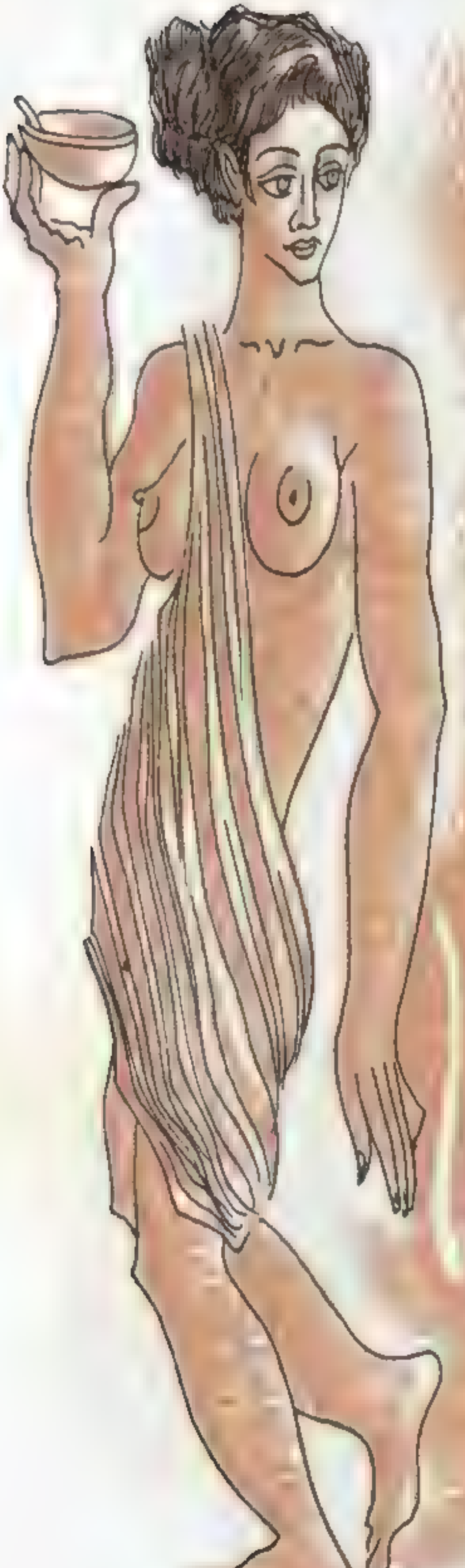

بڑدوں کی جو گلی اوٹ میں چھپ کر چور
آئی سیہ پوشاک میں، بیٹھی تھی جو دور
ظلمت کے حجاب سے، بالآخر نکلی
اک آبِ حیات کی وہ سوچ پُر نور

کل چھپ کے وہ آ گئی تو شب سی تھی رنگین
اور شمع کا وہ بجھنا ہی جو رکھی تھی قریں
خلوت میں تھا ظلمات کا عالم، جس میں
وہ آبِ حیات کی تھی سوچ کا شبہوں

کھلتی ہوئی کلیاں ہیں، چمن کی تیرے
رنگین سی روشنی ہے، تن کی تیرے
خلوت کی ہر اک شے پہ ہے ہلکی ہلکی
چھٹکی ہوئی چاندنی، بدن کی تیرے

وہ حسن نمایاں ہے بدن سے تیرے
ہر چیز درخشاں ہے بدن سے تیرے
اک تو جو نہ ہوتی تو اندھیرا ہوتا
خلوت میں چراغاں ہے بدن سے تیرے

باتوں میں وہ کھو گئی، تعجب یہ ہے
زانو پہ وہ سو گئی، تعجب یہ ہے
جو بات کہ ہونی ہی نہیں چاہیے تھی
وہ بات بھی ہو گئی، تعجب یہ ہے

لکھا ہوا راز ہے، سحر کے ہنگام
وہ سوز ہے ساز ہے، سحر کے ہنگام
جو شام تھی نقشِ ناز، ہاں ہاں وہ ہی
تصویرِ نیاز ہے، سحر کے ہنگام

کل رات وہ طمطراقِ حسنِ مغرور
وہ طنطنۂ الامان، وہ تیور بھرپور
بیدار رہا، آخرِ شب تک، لیکن
اِک عجز و نیاز و انکساری کا شعور

اُس شوخ کی، جس کا نہ ہے ثانی نہ عدیل
باتیں مری مانتے ہیں، اِتنی تعجیل
حیران ہوں کہ وہ نازکی مورت کیونکر
تصویرِ نیاز میں ہوئی ہے تبدیل

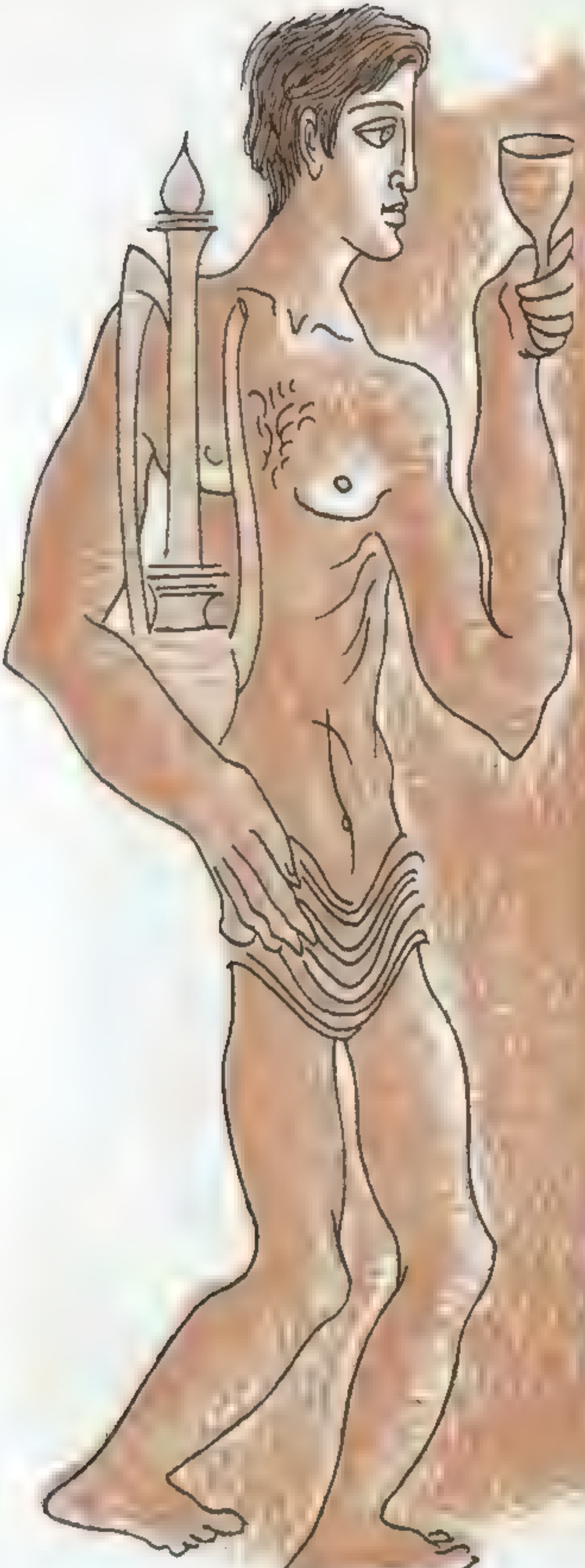

اے شوخ! میں ہوں قول میں اپنے صادق
اک صورتِ حالات کا میں ہوں خالق
تو مجھ پہ فریفتہ ہوئی تھی جس شام
اُس شام سے میں ترا نہیں ہوں عاشق

اس بات کے کہنے میں کہ پورا ہے وثوق
اے شوخ! یہ کیسی ہے خدا کی مخلوق!
کل تو ہی تو معشوق تھی، عاشق میں تھا
اور آج تو عاشق ہے تو میں ہوں معشوق

اب تیرا ہے التفات، قیمت میری
عاشق کی سی اب کہاں ہے حالت میری!
تھی تیرے تغافل کی جلووں میں زندہ
وہ تجھ سے بلاخیز محبت میری!

آدابِ تغافل کو اٹھا دیتی ہے
خود راہ میں آنکھوں کو بچھا دیتی ہے
میں تو ترا عاشق ہوں ولیکن اکثر
تو خود سے مجھے معشوق بنا دیتی ہے

۲۵۲

سب راز بتا دیئے تھے اِک اِک کر کے
سب پہلو دکھا دیئے تھے اِک اِک کر کے
خلوت میں حجاب سے تھے جتنے اب تک
کل اُس نے اٹھا دیئے تھے اِک اِک کر کے

مطلب ہے شباب کی یہ ہل چل دیکھو
اِس حسنِ بلا خیز کا کس بل دیکھو
سینے سے سرکتا ہوا اُس کے خود ہی
قدموں پہ وہ آ پڑا ہے آنچل دیکھو

طوفان ہے یہ موجِ زندگی بھی دیکھو
ہیں نور کے بقعے روشنی بھی دیکھو
آنکھوں میں کہا اُس نے گرا کے آنچل
اعضائے بدن کی دلکشی بھی دیکھو

یہ برہنہ بغل، یہ کوکھ، اُس پر آنچل!
مکھن سے شکم پہ نافِ ہیجان کا سماں
کھلتے ہی گرہ اور جو سرکی پوشاک
شکنوں کے پڑے ہیں گلابی سے نشان

۱۵۴

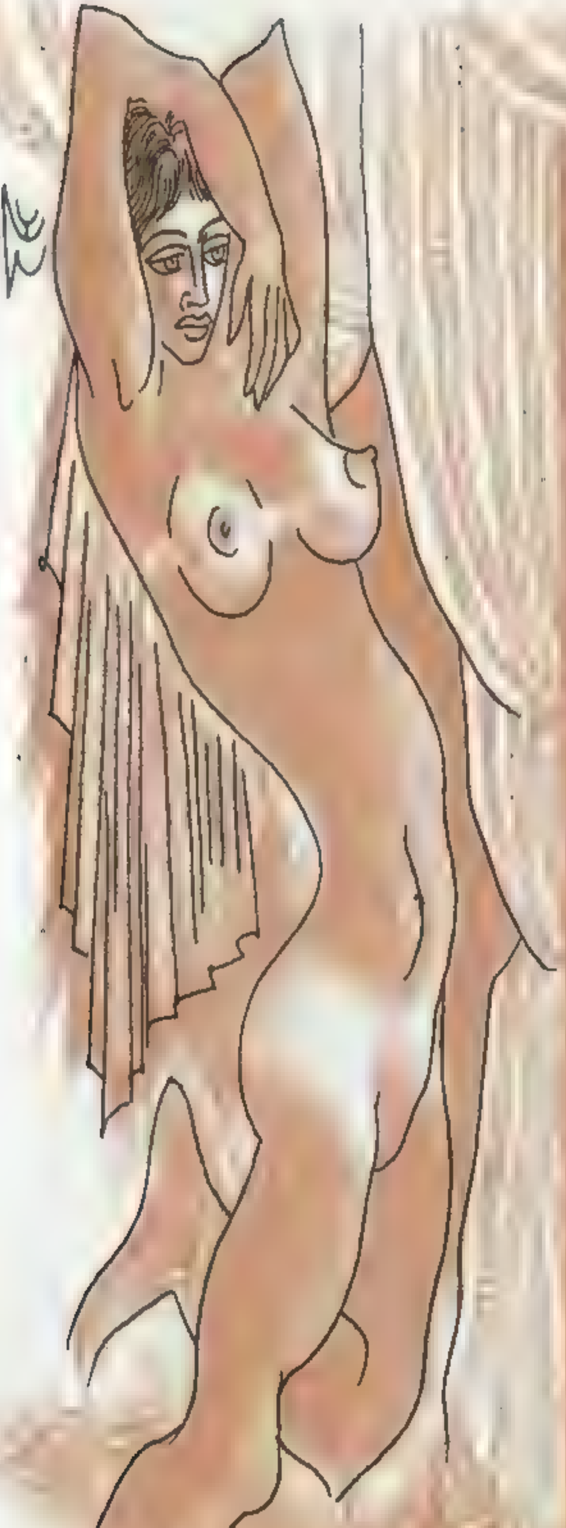

تانبے کی سی رنگت تھی، نہیں تھا گورا
اِک خاص ہی رقبہ حسین تھا گورا
ساحل سے وہ چھٹیاں منا کر آئی
تو جسم تھا سانولا، کہیں تھا گورا

ساحل سے وہ کرنوں کو سمو کر آئی
اِک ماہ وہاں دھوپ میں سو کر آئی
دیکھا تو کہیں کہیں تھی، بالکل گوری
ویسے تو بہت سانولی ہو کر آئی

ساحل سے وہ آ گئی، بلا کر دیکھیں
پُرشکل ہوا پردے جو ہٹا کر دیکھیں
جیسے پڑیں کترنی پھواریں اور پھر
ترشے ہوئے کاغذ کو اُٹھا کر دیکھیں

اُس شوخ کا اے دل جو ہے دم خم مت پوچھ
کیوں اب وہ ہوئی حسنِ مجسم مت پوچھ
تعطیل، جنوب سے منا کر آئی
گالوں پہ وہ چھینٹوں کا عالم مت پوچھ

اے شوخ! میں خود مست ہوا جاتا تھا
جو گام تھا، وہ جست ہوا جاتا تھا
کل جسم مرا اور یہ بدن بھی تیرا
آپس میں جو پیوست ہوا جاتا تھا

پھر رُک گیا چل کے، منتظر تھا تیرا
میں خوب سنبھل کے، منتظر تھا تیرا
میں رشتۂ شوق میں ذرا کچھ تجھ سے
آگے جو نکل کے، منتظر تھا تیرا

کس طرح بھلا برقِ تپاں کو روکوں!
چھوٹے ہوئے تیرِ بے اماں کو روکوں!
کچھ بس ہی نہیں، پھر بھی مگر فکر یہ ہے
اب کیسے نکلتی ہوئی جاں کو روکوں!

اُف جادۂ مستی پہ روانی تیری
بجلی کی سی رفتار ہے جانی تیری
اک آن میں اے جان! اُبل جائے گی
جذبات کے شعلوں پہ جوانی تیری

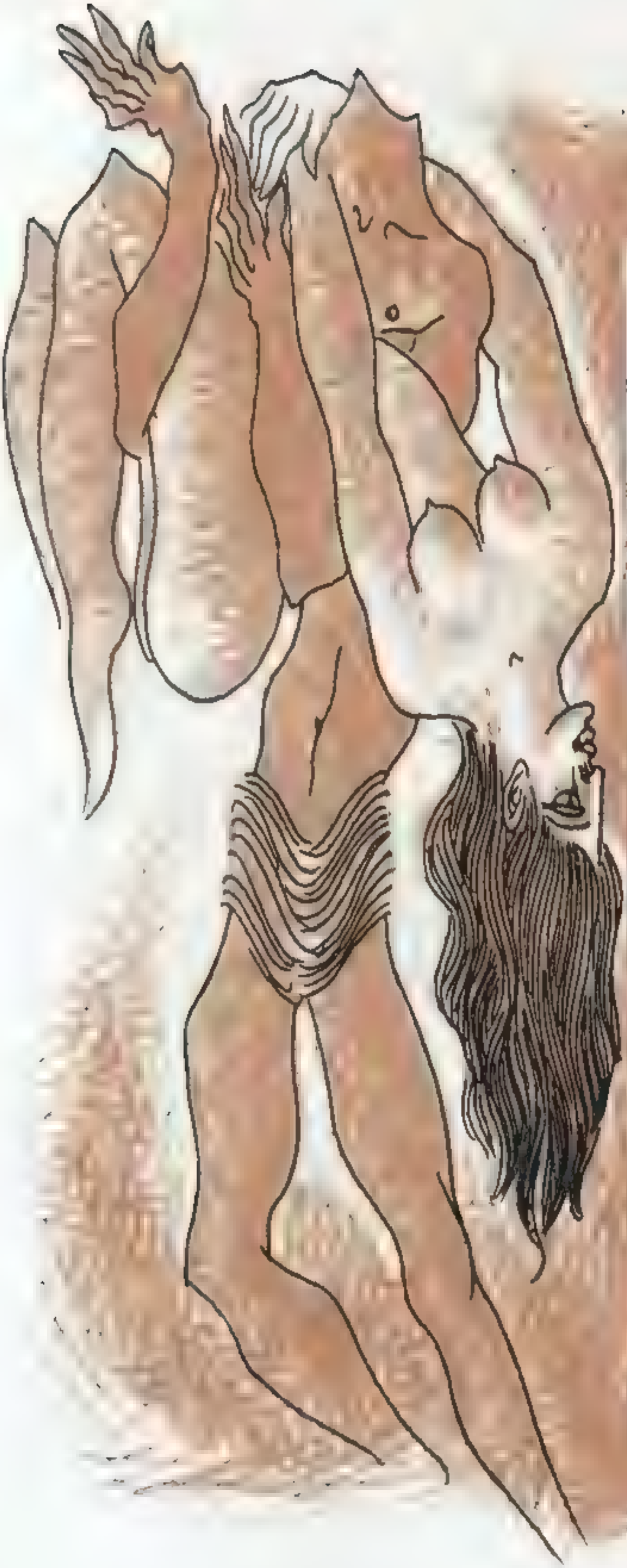

تو نقش ہے، جس میں رنگ بھرتا میں ہوں
بنتا ہوں، بگڑتا ہوں، سنورتا میں ہوں
تجھ کو لیے آغوش میں، اُف بحران
تلوار کی دھار سے گزرتا میں ہوں

اک لمحۂ نیم شب پہ رک جاتا ہوں
کچھ تیرے، کچھ اپنے ڈھب پہ رک جاتا ہوں
آثار جو منزل کے نظر آتے ہیں
اے جان! ابھی ہر طرب پہ رک جاتا ہوں

ایسے میں کہ خود حسن ہوا ہو گل ریز
رک جائیں تو پھر شوق لگائے مہمیز
ہم جادۂ مستی پہ چلے جاتے ہیں
آہستہ، کبھی تیز، کبھی بہت ہی تیز

پانی سا برستا تھا، چمن میں تیرے
بجلی سی چمک رہی تھی تن میں تیرے
جذبات کی دہکی ہوئی وہ آگ مگر
اک آن میں بجھ گئی بدن میں تیرے

کل رات لچک کر، وہ رُبا نے، کیا کیا
خلوت میں چلی رنگ دکھانے، کیا کیا
اِک خاص تمنّا کی نظر سے، مجھ سے
آنکھوں ہی میں کہتی تھی، نہ جانے کیا کیا!

جذبات سے لبریز وہ ساغر کر کے
آئینے میں بیدار وہ جوہر کر کے
پہلو میں، بہ صد ناز، لچک کر بیٹھی
وہ بندِ قبا کو مری زَد پر کر کے

اِک جامِ شراب تھا، جو باقی رکھا
باقی وہ حباب تھا، جو باقی رکھا
کل جملہ حجابات اُٹھا کر، اُس نے
تھوڑا سا حجاب تھا، جو باقی رکھا

خلوت میں وہ کل رات میں رہنا اُس کا
جذبات کی خاص رَو میں بہنا اُس کا
اور صورتِ حالات کے اِک موڑ پہ پھر
"دیکھیں کوئی دیکھ لے گا" کہنا اُس کا

"خود آپ ہی سمجھیں تو بُرا کیا ہوگا!
"دل میں ذرا سوچیں تو بُرا کیا ہوگا؟"
ترغیب مجھے دے کے، یہ اُس کا کہنا:
"کچھ ہو گیا دیکھیں تو بُرا کیا ہوگا!"

وہ بات کہ رُو بُرو، جو تجھ سے کی تھی
اُس بات میں تھا غلو، جو تجھ سے کی تھی
اُس کو کوئی سُن لے تو مَرے گا کتنا
تنہائی میں گفتگو، جو تجھ سے کی تھی

ہو جاتے جو بیدار ہیں، کرتے کیا ہیں!
ہم اور فقط پیار ہیں، کرتے کیا ہیں!
اے شوخ! ذرا سوچ تو سب سے چھُپ کر
ہم دونوں سمجھدار ہیں، کرتے کیا ہیں!

آپس میں محبتیں، ہماری کیا تھیں!
خلوت میں وہ راحتیں ہماری کیا تھیں!
اے شوخ! یہ محفل میں خیال آتا ہے
تنہائی میں حرکتیں ہماری کیا تھیں!

شہزادی، یہیں ہار کے آ پہنچی ہے
ٹھوکر پہ محل مار کے آ پہنچی ہے
درویش کی کوٹھری میں خدمت کرنے
شہزادوں کو دھتکار کے آ پہنچی ہے
شہزادی! فقیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں
کیوں آئی ہو؟ پیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں
یہ سُن کے، وہ خاک کشِ عشق، رُخ پہ تل کر
بولی کہ "امیروں کے یہاں کچھ بھی نہیں"
شہزادی! یہاں آئی ہو، دل جلتا ہے"
بولی کہ یہیں غنچۂ دل کھلتا ہے
کٹیا میں جو آتی ہوں تو مل جاتا ہے
جو کچھ مجھے محلوں میں نہیں ملتا ہے"
پہنچے ہوئے پیروں کی بلائیں لینے
بدلے میں وفاؤں کے وفائیں لینے
ٹھکرا کے امیروں کے وہ ہیرے کا تخت
آئی تھی فقیروں کی دعائیں لینے

خرم نے جو گمنام کو ہیرا کیا پیش
بولی کہ یہ شہزادہ نہیں صاحبِ کیش
ٹھکراتے ہی کٹیا کی طرف شہزادی
اِک پھول لیئے آئی برائے درویش

کل اُس نے فقیروں کی مدارات جو کی
کٹیا میں، یہیں ساتھ بسر رات جو کی
اُس رات کی واردات، اللہ اللہ
سو باتوں کی اِک بات تھی وہ بات جو کی

گمنام پہ ظاہر ہے عنایات ہیں کیوں
بیچاری سے مجہول سے سوالات ہیں کیوں
کٹیا میں جو ہو رہا ہے، بالکل ویسے
شہزادی کے پیکر پہ نشانات ہیں کیوں!

شہزادے نے کچھ بھی نہیں سستا سمجھا
اور ظلِّ سبحانی نے بھی خستہ سمجھا
ہم مست قلندروں کو لیکن اے دل!
شہزادی نے کلیوں کا رستہ سمجھا

ہاں حسن کا، دل پر جو فسوں ہے سُقراط!
تو مجھ کو محبت کا جنوں ہے سُقراط!
وقت آ گیا اک شوخ سے ملنے کا ارے
جاتا ہوں مجھے روکتا کیوں ہے سُقراط!

جاتا ہوں کہ وعدہ ہے کہیں ملنے کا
ورنہ نہیں پھر ایسا حسیں ملنے کا
اُس شوخ سے لازمی ملوں گا، لیکن
میں بُوعلی سینا سے نہیں ملنے کا

میں بور تھا سُن کے رات، چکر کیا ہے
آئی نہ سمجھ میں بات، چکر کیا ہے
اِن پر یہ بڑی دیر سے کیوں ہے تقریر
یہ کیا ہیں صفات و ذات؟ چکر کیا ہے!

رنگین تھیں کمرا درے جو ساری راتیں
وہ مجھ سے حسینوں کی نرالی گھاتیں
بے ساختہ یاد آئیں تھیں، میں نے تا دیر
کل عالمِ بالا کی سُنیں جب باتیں

ہیں پھول تخیّل میں، مسل ڈالے گی
کلیاں ہیں خیالوں میں کچل ڈالے گی
علّامہ کی تقریر تو سن لوں، لیکن
جاناں کے تصوّر میں خلل ڈالے گی

محبوب سے منہ موڑ کے ہم جائیں گے!
یوں اپنا ہی دل توڑ کے ہم جائیں گے!
علّامہ کی فلسفے پہ سننے تقریر
جاناں کو بھلا چھوڑ کے ہم جائیں گے!

کی اُن کے ہر اک غلو پہ "جی جی" میں نے
تقریر کے اُس غلو پہ "جی جی" میں نے
وہ سمجھے کہ سنتا ہے کچھ ایسے کی تھی
علّامہ کی گفتگو پہ "جی جی" میں نے

اک جال خیالات کا بنتا ہوں میں
یادوں کے جو موتی ہیں وہ چنتا ہوں میں
علّامہ کی گفتگو پہ "جی جی" کہہ کر
بس اِتنا دکھاتا ہوں کہ سنتا ہوں میں

کہلایا کہ بیٹھیں ہم، جو آئے، اُس نے
حمّام میں پھر رنگ لگائے، اُس نے
گیسو ہی بنانے پہ نہیں ہے موقوف
آئینے میں تیور بھی بنائے اُس نے

مرے دلِ پامال کو دیکھا اُس نے
پردے میں مرے حال کو دیکھا اُس نے
آئینۂ حمّام میں، چلتے چلتے
جب پھر سے خد و خال کو دیکھا اُس نے

ہر نقشِ حسین اور اُبھارا اُس نے
مکھڑے کو بھی کچھ اور نکھارا اُس نے
آگے مرے، آ کے بیٹھنے سے پہلے
زلفوں کو کئی بار سنوارا اُس نے

اب اپنی زبان پر تو فقط ہے فریاد
آوارہ خیالات ہیں، دل ہے برباد
پتھر سے جو دل کو موم کر دے اُس نے
آئینے میں وہ ادا بھی کر لی ایجاد

خوشبوئے بہار کا تکلف کیوں ہے
مکھڑے کے نکھار کا تکلف کیوں ہے؟
ہم سے بھی ملاقات کی خاطر، آ جان!
یہ اتنا سنگھار کا تکلف کیوں ہے؟
اُف کتنی بہاریں، سحر سے وہ ہے
مکھڑے کے نکھار ہیں، سحر سے وہ ہے
ہلکی سی، بر شام دکھانے کو جھلک
مشغولِ سنگھار ہیں، سحر سے وہ ہے
بُت ساز کو ہے فہم کہ مورت کیا ہے
نقاش کو ہے علم کہ صورت کیا ہے
پھر ہم سے ملاقات کی خاطر، تم کو
اِس حد کے سنگھار کی ضرورت کیا ہے؟
جب میری تھی منتظر تو حالت کیا تھی
اُف سولہ سنگھار میں وہ صورت کیا تھی
اُس شوخ نے آتے ہی کہا تھا میں نے
ہم سے یہ تکلف کی ضرورت کیا تھی

ملنے گیا، ہر چند کہ کم تھا کل وقت
تنہا برا نہ نشیں میں گزرا کل وقت
حمّام میں کرتی رہی ضائع، وہ شوخ
آرائشِ کاکُل میں بہت سا کل وقت

بادل میں اگر وہ تو زمیں میں، میں ہوں
کھویا ہوا اِک خوابِ حسیں میں، میں ہوں
حمّام میں، آرائشِ کاکل میں ہے وہ
تنہا یہاں اُس کی شہ نشیں میں، میں ہوں

جب ملنے گیا اُس سے بہ حُسنِ تدبیر
حمّام میں تھی، حُسن کی عُریاں شمشیر
تادیر وہ شہ نشیں میں، میں نے اُس کی
رکھی ہوئی کارنس پہ دیکھی تصویر

کاموں سے نکال کر ذرا سی مُہلت
ملنے جو گیا کل تو بہت تھی عجلت
حمّام میں اُس شوخ کو لیکن افسوس
آرائشِ کاکل سے نہیں تھی فرصت

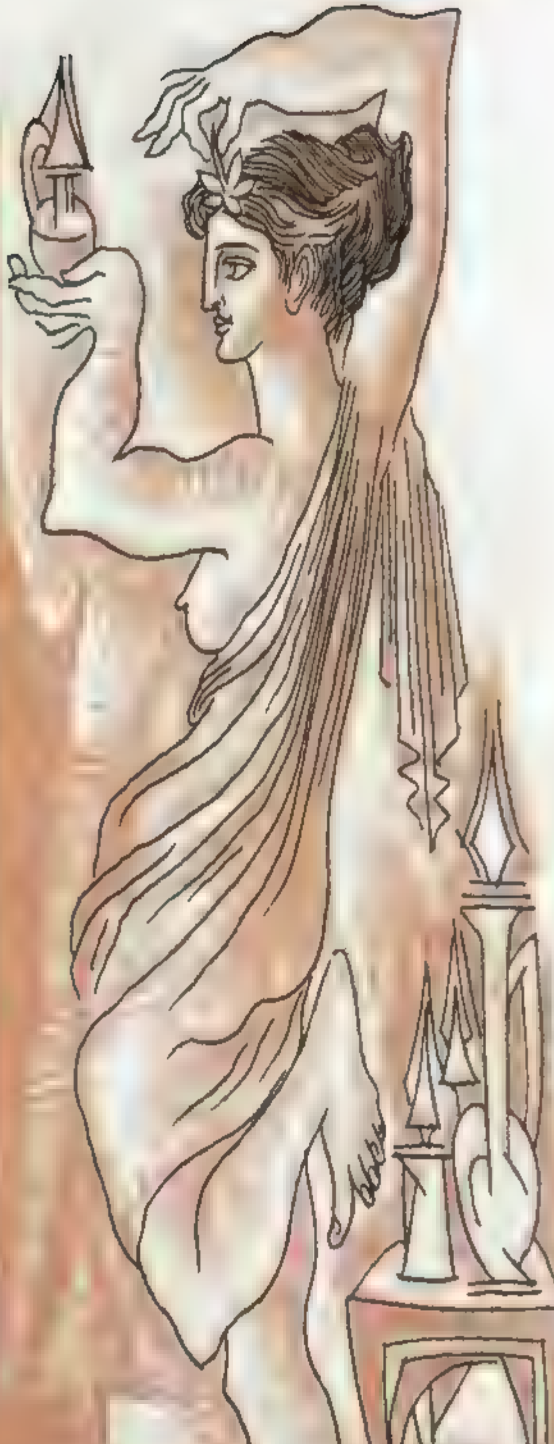

کس نے کہا؟ آرائشِ صورت مت کر
کس نے کہا؟ زیبائشِ قامت مت کر
خوبصورتی تری، ہے امانت حق کی
اے شوخ! امانت میں خیانت مت کر

اپنے قد و قامت کو سجا کر لائی
گلدستہ وہ زلفوں کو بنا کر لائی
میں رہ گیا، گہری سانس بھر کے، خاموش
خوشبو میں وہ جب خود کو بسا کر لائی

وہ بن کے قیامت آئی، میں نے دیکھا
آنکھوں میں مری سمائی، میں نے دیکھا
پھر اُس کے بدن کا حُسن، مجھ سے اُس نے
جیسے ہی نظر بچائی، میں نے دیکھا

رنگ اپنا سوا، نورِ سحر سے دیکھا
مکھڑے کو حسین تر، گُلِ تر سے دیکھا
آئینے میں، کل مجھ سے وہ بل کر، اُس نے
خود کو جو ذرا مری نظر سے دیکھا

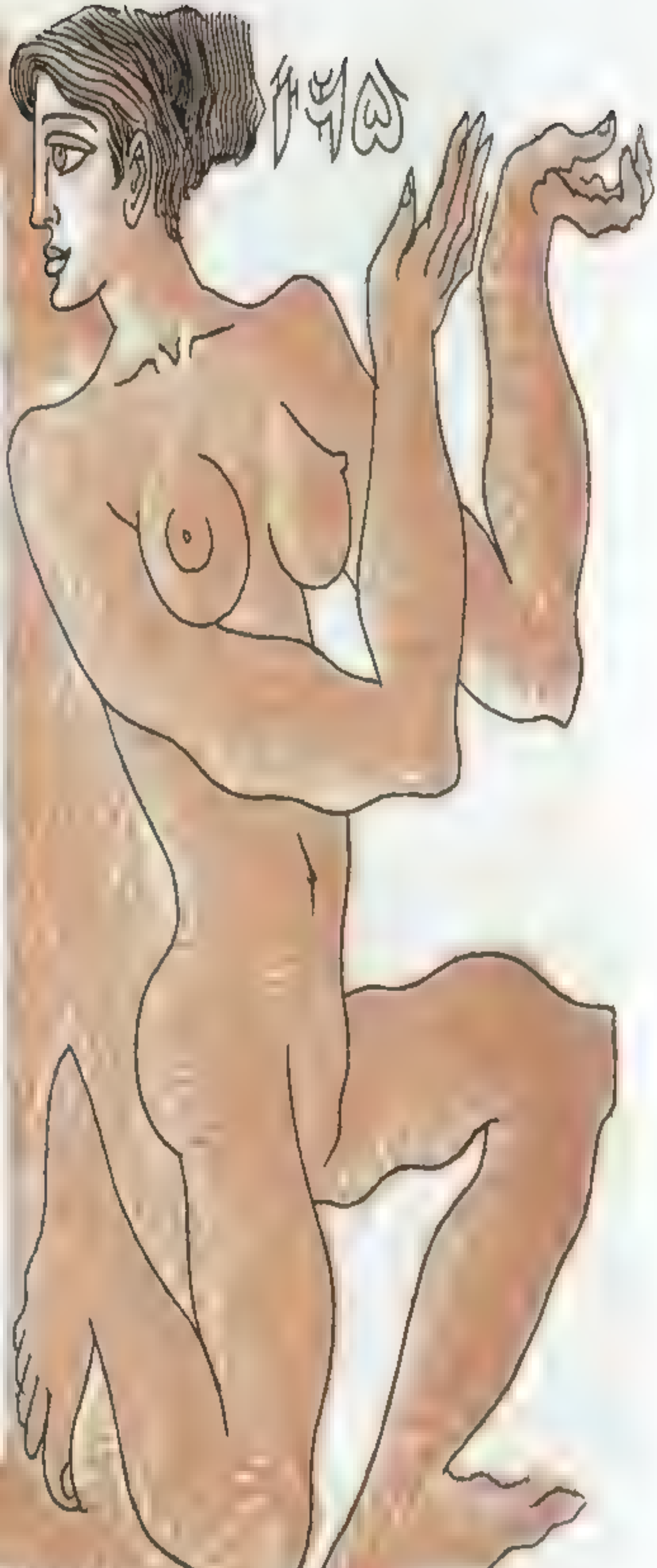

حالات کی گردش سے بڑی ہے تشویش
دل رکھنے کی کوشش سے بڑی ہے تشویش
کل جس کے تغافل نے کیا تھا بے چین
آج اُس کی نوازش سے بڑی ہے تشویش

آئی نہ سمجھ میں بات، اتنا کیوں ہے!
میرے لیے زن بجارت، اتنا کیوں ہے!
کل اُس کا تغافل تو بجا تھا، لیکن
آج اُس کا یہ التفات، اتنا کیوں ہے!

گُن گاتی وہ اب نگار میرے کیوں ہے!
گھر آتی وہ بار بار میرے کیوں ہے
کل جس کو بس اک پھول دیا تھا میں نے
وہ آج گلے کا ہار میرے کیوں ہے

میں اپنے مذاق سے بہت ہی خوش ہوں
اب اُس کے نفاق سے بہت ہی خوش ہوں
کل جس کے وصال کی تھی حسرت مجھ کو
آج اُس کے فراق سے بہت ہی خوش ہوں

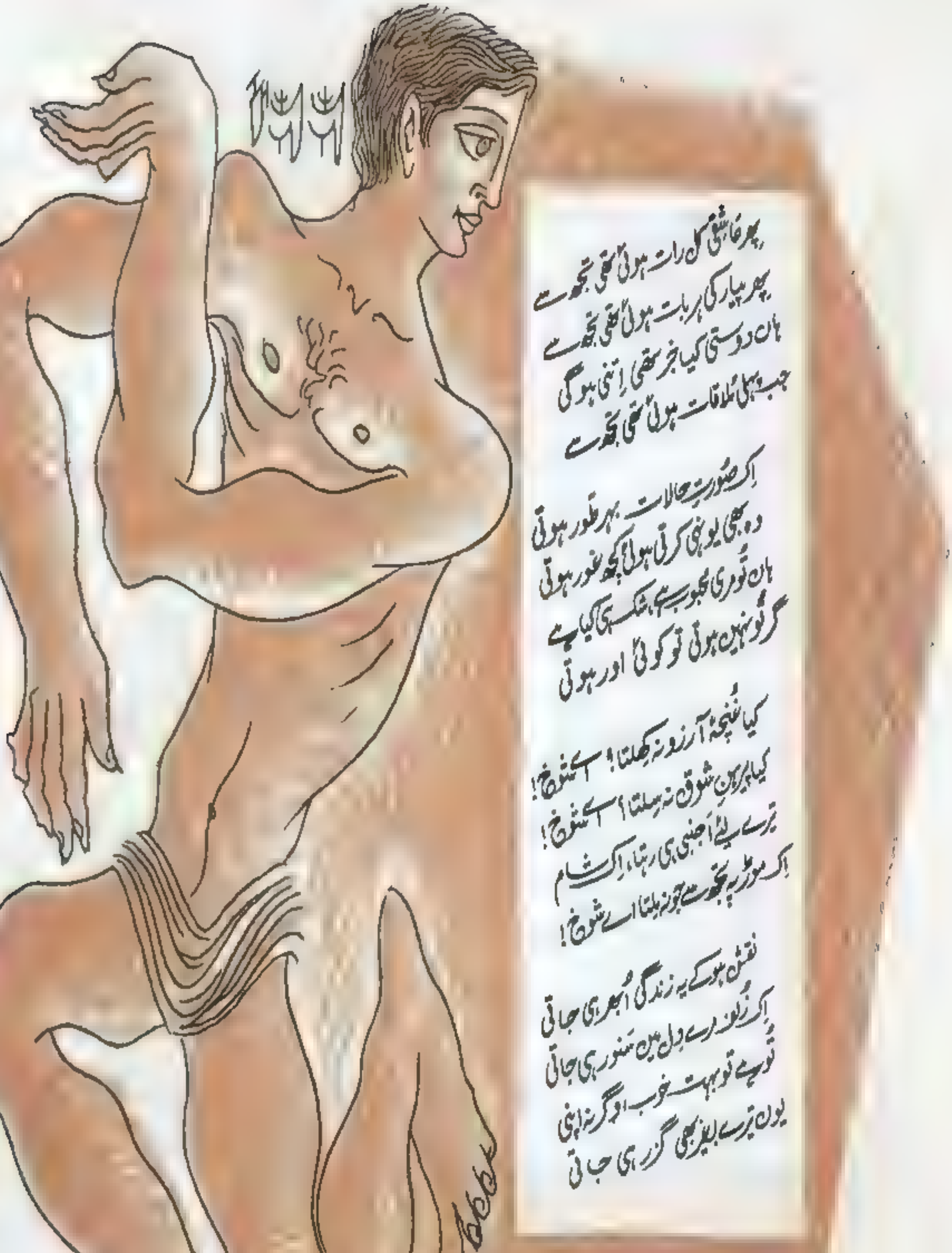

پھر عاشقی کل رات ہوئی تھی تجھ سے
پھر پیار کی ہر بات ہوئی تھی تجھ سے
ہاں دوستی کیا خبر تھی اِتنی ہوگی
جب پہلی مُلاقات ہوئی تھی تجھ سے

اِک صُورتِ حالات بہر طور ہوتی
وہ بھی یونہی کرتی ہوئی کچھ غور ہوتی
ہاں تُو مری محبوب ہے، شک ہی کیا ہے
گر تُو نہیں ہوتی تو کوئی اور ہوتی

کیا غُنچۂ آرزو نہ کِھلتا! اے شوخ!
کیا پیرہنِ شوق نہ سِلتا؟ اے شوخ!
ترے لیے اجنبی ہی رہتا، اِک شام
اِک موڑ پہ تجھ سے جو نہ مِلتا اے شوخ!

نقش ہو کے یہ زندگی اُبھر ہی جاتی
اِک زُلف ترے دل میں سنور ہی جاتی
تُو ہے تو بہت خوب، اگر نہ ہوتی
یوں ترے بغیر بھی گزر ہی جاتی

ہر گوشے میں، اک رنگِ حِرائی گھل جائے
تو اپنی ہی نظروں میں یہ اِک تُل جائے
حمّام میں، جیسے ہی قدم تو رکھ دے
آئینۂ حمّام کا جوہر کھُل جائے

حمّام میں، اُس کے، ہیں فضا نے کیا کیا
آئینوں میں ہیں، رنگ سہانے کیا کیا
گوشے میں سنگھار کے ہزاروں سامان
لٹکا ہوا کھونٹیوں پہ اجالے کیا کیا!

خوشبو سے وجود کو معطّر کر کے
آئینے میں، نکھرے کو گلِ تر کر کے
آئی۔ تنِ شفّاف کی موزونی میں
وہ، خاص خطوط کو اُجاگر کر کے

جب پہنچا تو محرابِ یقیں میں دیکھی
ناگن سی کوئی جسمِ حسیں میں دیکھی
اک بولتی چلتی ہوئی رعنائی کی
تصویر تھی، جو شاہ نشیں میں دیکھی

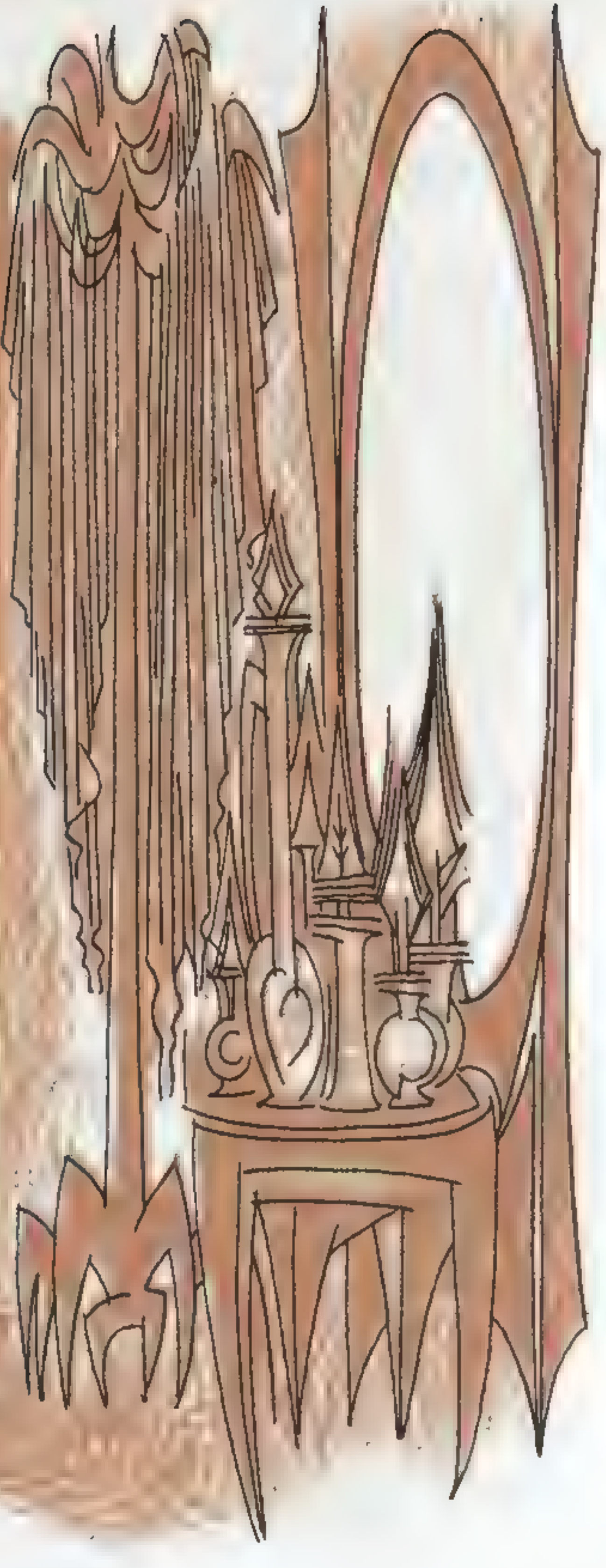

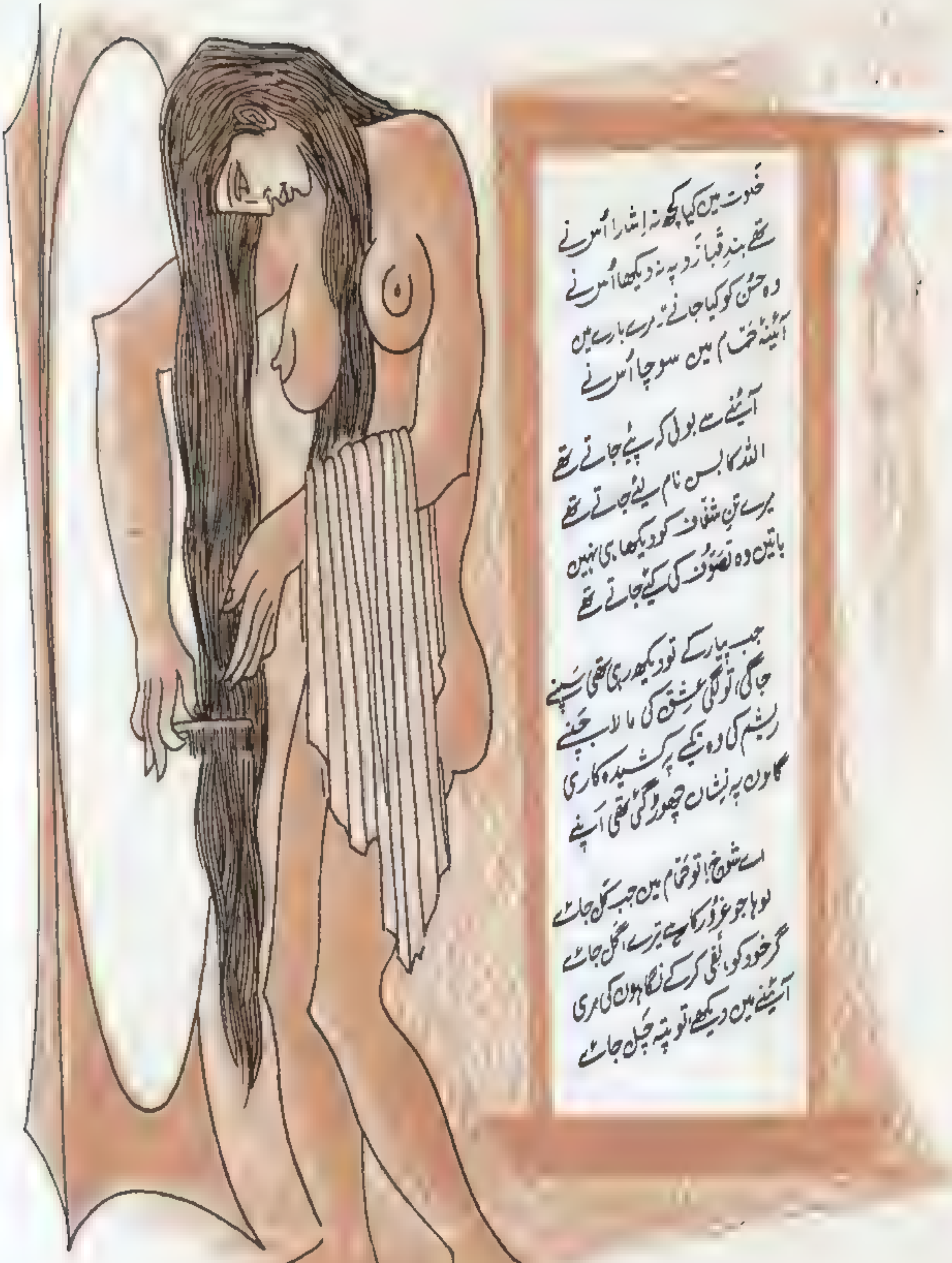
خلوت میں کیا کچھ نہ اشارا اُس نے
تھے بندِ قبا زد پہ نہ دیکھا اُس نے
وہ حسن کو کیا جانے "مرے بارے میں
آئینۂ حمّام میں سوچا اُس نے
آئینے سے بولی کہ سپنے جاتے تھے
اللہ کا بس نام لیے جاتے تھے
میرے تنِ شفاف کو دیکھا ہی نہیں
باتیں وہ تصوّف کی کیے جاتے تھے
جب پیار کے تو دیکھ رہی تھی سپنے
جاگی، تو لگی عشق کی مالا جپنے
ریشم کی وہ تکیے پہ کشیدہ کاری
گالوں پہ نشان چھوڑ گئی تھی اپنے
اے شوخ! تو حمّام میں جب کُھل جائے
تو ہاں جو غرور کا ہے تیرے، گُھل جائے
گر خود کو، ننگی کر کے نگاہوں کی مری
آئینے میں دیکھے، تو پتہ چل جائے

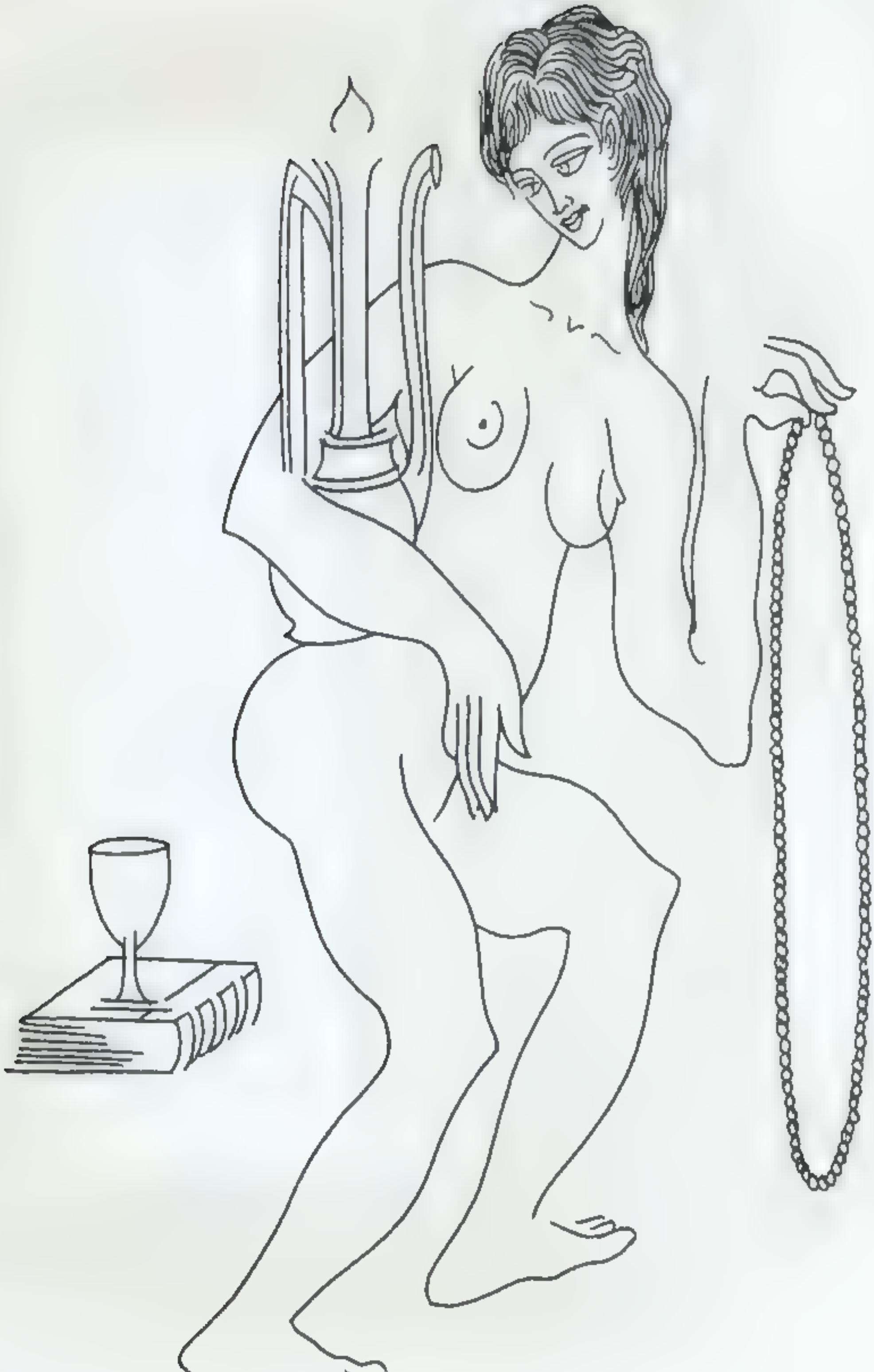

مُتفرقات

اِسے سرکش و وحشی کی کمر توڑ بھی دو
اِسے باغی گستاخ کا سر پھوڑ بھی دو
اِتنے میں حسینوں نے کہا منت سے
یہ مست قلندر ہیں انہیں چھوڑ بھی دو

میں ہوں، وہ بھی شیدائے گلابی کیا ہے!
میری ہی طرح وہ بھی شرابی کیا ہے!
جاناں کا ہے اِک چاہنے والا، ورنہ
کچھ اور رقیب میں خرابی کیا ہے!

جاں مانگی۔ تو وہ سامنے آیا بڑھ کر
وہ سر کو جھکا کے مُسکرایا بڑھ کر
جاناں کے لیئے میں نے تو ناخن نہ دیا
گردن کو رقیب نے کٹایا بڑھ کر

ہے وہ ہی، جو ہر تیر کا بچہ، عاشق
وہ پکا تھا اور میں کہ تھا کچا عاشق
میں تو تھا برائے نام، ورنہ سچ ہے
جاناں کا رقیب ہی تھا سچا عاشق

اونچا کتنا نصیب ہوتا اپنا
محبوب کہ خود حبیب ہوتا اپنا
جاناں کے لیئے جان بھی دیدی ہوتی
میں خود جو اگر رقیب ہوتا اپنا

خطباتِ مساجد میں، مکاتب میں سبق
محلوں میں لکھے ہوئے لکھوکھا ہی ورق
اُن سب سے ہے اِک کروڑ درجے بڑھ کر
کُٹیا میں قلندر کی یہ "ہُو حق ہُو حق"

منطق کی سمجھتے ہوئے گتھیاں یہ لوگ
بحثوں میں گزارتے ہیں راتیں یہ لوگ
ہیں تیرے ہی بارے میں فقط سوچ پہ ہوں
کرتے ہیں اِدھر اُدھر کی باتیں یہ لوگ

آگے سے ترے گزرا وہ محزوں، زاہد!
اِس پر تجھے اتنا طیش ہے کیوں؟ زاہد!
اُس کو نہ تھا معلوم تو پڑھتا ہے نماز
لیلیٰ کے خیال میں تھا مجنوں، زاہد!

شیلنگ کی چوٹیوں پہ گویا چڑھ کر
لاحول ولاقوۃ یعنی پڑھ کر
کل شیخ نے مینا پہ جو پتھر مارا
میں نے دلِ بیتاب پہ روکا بڑھ کر

تحفے میں رقیب نے جو خوشبو دی تھی
یہ سوچ کے اُس شوخ نے آخر لی تھی
ملنا تھا اُسی شام کو مجھ سے آکر
مہکی ہوئی آئی تو کشش کتنی تھی

روشن جو تخیّل میں وہ صورت سی تھی
معراجِ تصوّر کی بدولت سی تھی
کل شب کے اندھیرے میں سمجھ کر پروین
تا دیر ثریّا سے محبت کی تھی

ہیں اور اگر خار تو خنجر تو ہے
بہتر جو ہے سب سے اُس سے بہتر تو ہے
کل رات کسی اور کے، جانِ شیریں!
بوسے لیے میں نے یہ سمجھ کر تو ہے

بجلی جو بدن میں اُن کے چمکی شب میں
پھر اُن کی قبائے علم اُتری شب میں
کیسے کیسے حکیم، مجھ سے مت پوچھ
کچھ دیر کو ہو جاتے ہیں وحشی شب میں

ساغر ہو اگر خالی تو بھرتے رہنا
تم یوں تو ہر اک شوخ پہ مرتے رہنا
اس بزم میں زرق برق، یارو! لیکن
حاکم کی بھی داشتہ ہے، ڈرتے رہنا

لو حسن اُدھر جام بکف جاتا ہے
اور نام مرا کر کے حذف جاتا ہے
ہم حسن پرستوں سے بچا کر دامن
سرمایہ پرستوں کی طرف جاتا ہے

یہ رُوٹھے تجارت پہ ہے مسند دیکھو
دولت کا جو کھنچ رہا ہے رستہ دیکھو
حاکم کے لیے محفل سجائی ہے، اس میں
زردار کی داشتہ کا ٹھسّہ دیکھو

وہ محفلِ تاجران برائے حکام
میں اُٹھ گیا بور ہو کے وہیں چھوڑ کے جام
اُٹھتے ہی مرے، جتنے حسیں تھے وہ بھی
ڈکار کر کے وہاں سے اُٹھے کل شام

انگشت، جب اعداد کے غم سہتی ہو
تم ہو کہ نہیں! جب یہ خلش رہتی ہو
اک جان سی پھر جان میں آجاتی ہے
تم فون پہ جب خود ہی "ہلو" کہتی ہو

کل فون پہ مجھ سے، اے سراپا انداز
وہ گفتگو کرتی تھی، ترا تر تھی جو راز
اُس بات کی شہ رگ پہ چھری اٹھی گویا
بھاری سی جو اک آئی "ہلو" کی آواز

ہاں جملہ خرافات پہ "جی جی" "جی جی"
مہمل سی روایات پہ "جی جی" "جی جی"
ہاں کہتا ہوں بنتِ شیخ! تری خاطر
میں، شیخ کی ہر بات پہ "جی جی" "جی جی"

کب سمجھے، محبت کے لیے آیا تھا
اک چاندی صورت کے لیے آیا تھا
پہنچا تو تھے اُس شوخ کے بابا بیمار
وہ سمجھے عیادت کے لیے آیا تھا

میں نے دلِ بیتاب پہ رکھ کر کچھ گھاؤ
اِس گاؤں سے جانے کو لگائی جب ناؤ
مہ پاروں نے آرائشِ کاکل چھوڑی
دشمن نے مگر مونچھ پہ اپنی دیا تاؤ

جب شہر میں میخوارِ عراقی نہ رہا
شوقین پھر آئینوں کا ساقی نہ رہا
آئینہ فروشی کی تجارت کا فروغ
جاتے ہی مرے شہر میں باقی نہ رہا

اک سناٹا سا ہے، خود بھی نہیں ہوں گھر میں
جس گوشے میں دو بیٹھے ہیں صد ہیں ہوں گھر میں
یہ در پہ جو دے رہا ہے کوئی دستک
اس سے کوئی کہہ دو کہ نہیں ہوں گھر میں

جاناں سے کسی طور جو دوری کرلوں
پھر سے دلِ خاکی کو میں نوری کرلوں
یہ وصل کی راتوں کی مسلسل نیندیں
آئے جو شبِ ہجر تو پوری کرلوں

اُس شوخ نے جب جھیل چکی تاریکی
ہر بات میں پیدا کی عجب باریکی
خلوت میں، اِک عاشق کی میرے آگے
کل اُس نے بہت خوب اداکاری کی

اپنے یہاں اِک جشن منایا اُس نے
وہ شوخ تھی، مجھ کو بھی بلایا اُس نے
پرسے لیے اک شخص نے پوچھا "یہ کون؟"
"اِک مست قلندر ہیں" بتایا اُس نے

کیا چاہتے ہو مجھ کو میری جاں! ہاں ہاں
اِس پر مرا یہ کہنا کہ جاناں! ہاں ہاں
اِک لمحۂ نازک تھا تو کی تھی میں نے
اُس شوخ کی ہر بات پہ ہاں ہاں! ہاں ہاں

"تم سے ہے مجھے عشق" بتایا اُس نے
"تم کو بھی محبت ہے؟" یہ پوچھا اُس نے
اثبات میں سر میں نے ہلایا ایسے
جیسے کہ نفی میں ہو، نہ دیکھا اُس نے

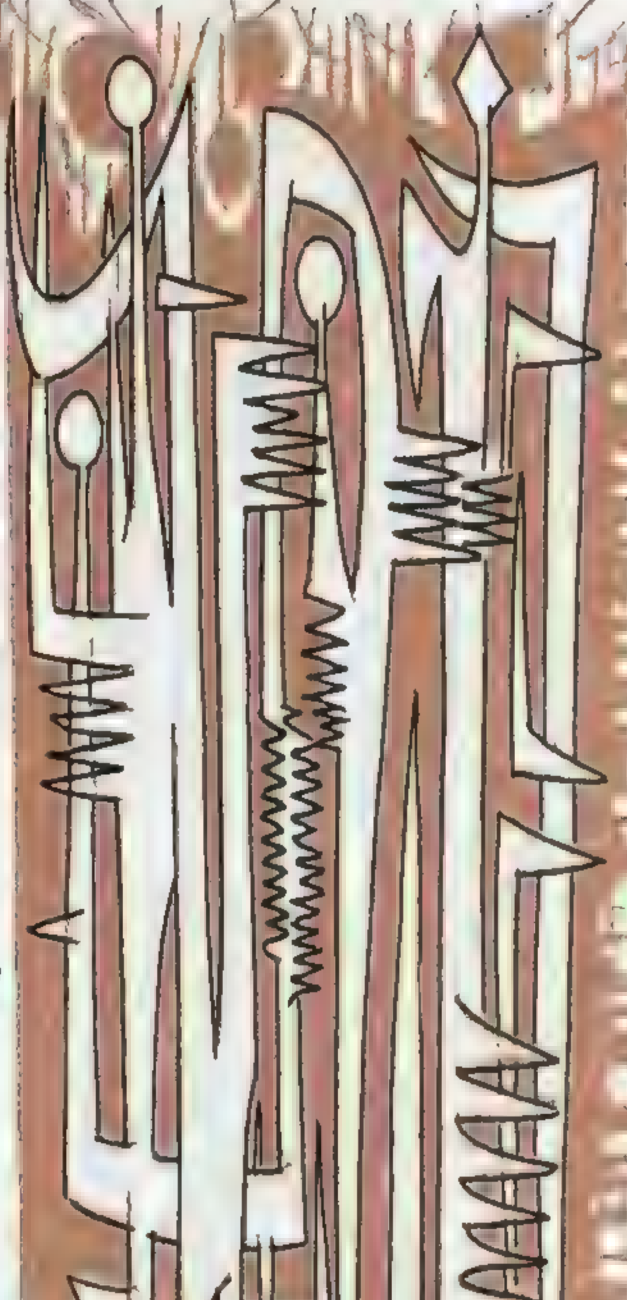

بھیگی ہوئی دیوار ہے، گرتا در ہے
برسات ہے، برسات میں ہم کو ڈر ہے
شہراہِ منوّر پہ ہے قصرِ جاناں
تاریک سے کوچے میں ہمارا گھر ہے

ہر راہ طویل ہے، کسی کا غم ہے
اس فکر میں دل کا بھی عجب عالم ہے
گر کوچۂ داشتہ سے ہو کر جاؤں
تو فاصلۂ کوچۂ جاناں کم ہے

وہ اُس کی عبارت، وہ ادا کا عالم
وہ عارضِ گلرنگ، وہ گیسوئے برہم
جب غور سے داشتہ کو دیکھا میں نے
جاناں سے جمال میں نہیں تھی کچھ کم

اس عشق میں مجبور ہوں، پامال ہوں میں
بیکار ہوں، قلّاش ہوں، کنگال ہوں میں
واں خلوتِ داشتہ میں کیا تھا جو نہ تھا
یاں کوچۂ جاناں میں پھٹے حال ہوں میں

نجد کی طرف مجنوں کی واپسی

رُخ کر لے چمن کا یہ قفس کا مت کر
جس کام کا تجھ کو نہیں چسکا مت کر
لکھتا ہوں رباعی تو یہ دل کہتا ہے
جو کام نہیں ہے تیرے بس کا مت کر

الوان کے دریا کے کنارے سے، آجا
لے کر تو خطوط کے سہارے، آجا
تو خلوتِ تصویر میں، بولی تصویر
واپس مرے صادقین پیارے آجا
جو زخم یہاں کھائے دکھاؤں جاکر
خط، رستے ہوئے خون سے بناؤں جاکر
اب منزلِ تصویر میں بہتر یہ ہے
روٹھی ہوئی حوروں کو مناؤں جاکر
الوان و خطوط کے چمن کی خاطر
یعنی کہ مصوری کے فن کی خاطر
اے شعر کے غیرملک! آیا کل تھا
جاتا ہوں میں آج اپنے وطن کی خاطر
الوان کے ایوان میں چلا آیا ہوں
بڑھتے ہوئے طوفان میں چلا آیا ہوں
میں کوچۂ جاناں سے نکل کر واپس
پھر کوچۂ جاناں میں چلا آیا ہوں

ہاں موقلم و لوح کا بگڑا تھا مزاج
الوان کی شہزادی کے سر پر نہ تھا تاج
حلقے میں رباعی کے جو دو دن رہ کر
میں خانۂ تصویر میں پہنچا جب آج
اک لوح یہ بولی مری آئین آنکھیں
آیا نہ تو گو میں نے بچھائیں آنکھیں
کیوں کوچۂ خیام میں جا کر تو نے
لیلائے معانی سے لڑائیں آنکھیں
شوخی نہ شرارت کی نظر سے دیکھا
ہر جانب کو حیرت کی نظر سے دیکھا
میں خانۂ تصویر میں پہنچا جب آج
لوحوں نے شکایت کی نظر سے دیکھا
الفاظ کی بستی سے میں ہو کر کنگال
کل شہرِ مداد میں جو پہنچا بے حال
تو میرے لیے لایا ہے کیا؟ میری طرف
ہر لوح بڑھاتی ہی رہی دستِ سوال

کیں لغزشیں شاعری میں، واپس آیا
پھر کوچۂ بُت گری میں، واپس آیا
تصویروں نے سینے سے لگایا مجھ کو
جب شہرِ مُصوّری میں واپس آیا

تھا خلوتوں میں دہکی انگیٹھی کا سماں
سب لوگ سمور میں ٹھٹھرتے تھے جہاں
اور چوک پہ صادقین، ہُو حق کرتا
تھا ننگا پسینے میں شرابور وہاں

ناراض تھی لیلیٔ نگارش مجھ سے
غصے میں تھی دوشیزۂ بندش مجھ سے
تھا کوچۂ خیام میں اُفتاں خیزاں
ہر گام پہ ہو رہی تھی لغزش مجھ سے

لغزش تو ہوئی آخر سنبھل بھی جاؤ
آوارہ ہو اِس نگر سے ٹل بھی جاؤ
اِس میں رہو اک شب بھی تو رسوائی ہے
خیام کے کوچے سے نکل بھی جاؤ

تصویروں میں ساحری کی سوجھی کیوں تھی
عریانی کو مصوری کی سوجھی کیوں تھی
کل میں نے بھی کہہ دیئے تھے اک دو مصرعے
کل مجھ کو بھی شاعری کی سوجھی کیوں تھی

سب ہنستے تھے میں بھی گا کے ننگا ناچا
ہر اک سے نظر ملا کے ننگا ناچا
تاریک و طویل و سرد شب تھی، پھر بھی
میں کوٹھے ادب میں جا کے ننگا ناچا

طاری اک خود پہ خبط کر کے میں نے
قائم لفظوں سے ربط کر کے میں نے
کچھ یونہی سی اوراق کی خدمت کی ہے
الوان کے حق کو ضبط کر کے میں نے

پاس اپنے اک اُمنگ کے علاوہ کیا تھا
واں دل بھی کوئی ڈھنگ کے علاوہ کیا تھا
میں کوچۂ خیام میں بولا جو کچھ
مجذوب کی اک ترنگ کے علاوہ کیا تھا

یہ میری انا ہے شعرا اہلِ دانش!
مجروح تھی اور اسیر نہیں تھی لیکن
تو چاہا اوراق پہ نقاشی نے
خطاطی کے تیل سے کی آرائش